علامہ محمد اسد

مترجم: پروفیسر احسان الرحمٰن

دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اسلام دوراہے پر

علامہ محمد اسدؒ

اردو ترجمہ

پروفیسر احسان الرحمٰن

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

موضوع : اسلام دوراہے پر

مصنف : علامہ محمد اسدؒ

مترجم : پروفیسر احسان الرحمٰن

نظر ثانی : ڈاکٹر محمد شاہد رفیع

نگران طباعت: حیران خٹک

حروف خوانی: محمد اشتیاق خاکی

کمپوزنگ: کیپٹل کمپوزنگ سنٹر، اسلام آباد

طابع : ادارہ تحقیقات اسلامی پریس

تعداد : ۲۰۰۰

سال اشاعت: ۲۰۱۱ء

قیمت: ۔/۵۶ روپے

ISBN: 987-969-556-258-5

ناشر

دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرست

پیش لفظ

بلاشبہ ابدی حقیقتوں سے آگاہی کے لیے علم بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ آج دُنیا میں مادّی ترقی کا عروج اسی فہم و دانش کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوا۔ قرآن مجید اور صاحب قرآن علیہ الصلوۃ والسلام نے تفکر و تعقل پر بہت زور دیا، هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون فرما کر اہلِ علم کے سروں پر دستارِ فضیلت رکھ دی...... لیکن دل کے دریچے وا کرنے اور ہدایت سے سرفرازی کے لیے علم سے کہیں زیادہ اللہ کے فضل کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اوّلین مخاطبین میں وہ بھی تھے جو اس معاشرہ کے انتہائی ذی علم اور عقل و شعور کے مالک سمجھے جاتے تھے اور اُن کے ساتھ ہی ساتھ وہ بھی تھے جن کے منڈیوں میں سودے ہوتے تھے...... مگر ظاہری عِلم و شعور کے باوصف ہدایت سے محرومی اُن کا مقدر بنی اور جنہیں بکاؤ مال سمجھا جاتا تھا وہ بازی لے گئے اور ہدایت کے نور سے معمور ہو گئے۔ آج کی دُنیا پر بھی ایک نگاہ ڈالیں تو یہی مناظر نظر آئیں گے کہ ظاہری عِلم اور فہم و فراست سے مخاطبین کو مبہوت کر دینے والے نُورِ ایمان سے محروم ہیں۔ بقول حضرت اقبالؒ:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا
وہ جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

رشک آتا ہے اُن خوش نصیبوں پر جن کی پیدائش غیر مسلم گھرانے میں ہوئی، غیر مسلم ماحول میں پروان چڑھے، جوانی کی حدوں کو چُھوا، ملک ملک کی خاک چھانی، مذاہب عالم کی

ورق گردانی کی، ہر معاشرہ کی بنیادی قدروں کو جانچنے پرکھنے کا موقع ملا اور غور وفکر کی متلاطم موجوں سے نکلے تو نبی آخرالزّماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر قربان ہو گئے، مشرف باسلام ہو گئے۔ صرف یہی نہیں اپنے مطالعہ کا عرق مختلف کتابوں کی صورت میں نذرِ قارئین کیا۔ علامہ محمد اسد بھی اُن خوش نصیبوں میں سے ہیں جو پیدائشی مسلمان نہیں بلکہ اسلام اُن کا انتخاب ہے اور یہ انتخاب اُن کا افتخار ہے۔ علامہ محمد اسد مرحوم کی دیگر تصانیف کو بھی پذیرائی حاصل ہُوئی اور اس کتاب کے مفید تر ہونے کی شہادت حکیم الاُمت علامہ محمد اقبالؒ نے ان الفاظ میں فرمائی:

''یہ کتاب انتہائی دلچسپ ہے، مجھے کوئی شبہ نہیں کہ حلقۂ بگوش اسلام ہونے والے ایک انتہائی مہذّب یورپی کی یہ تصنیف ہماری نئی نسل کے لیے چشم کشا ثابت ہوگی''۔

اس کتاب کے جملہ ابواب تحقیق و تفحص اور ذاتی مشاہدات پر مشتمل ہیں لیکن میری نظر میں ''تقلید'' اور ''سنت نبویؐ کی روح''، پر مشتمل ابواب بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

علامہ محمد اسد مرحوم کی یہ مختصر مگر جامع تحریر جسے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے انگریزی زبان کے اُستادِ مکرم جناب پروفیسر احسان الرحمٰن صاحب کی قابل ستائش کوشش سے تیار کردہ ترجمہ ''اسلام دوراہے پر'' کے عنوان سے دعوۃ اکیڈمی بارِ دیگر زیورِ طبع سے آراستہ کر رہی ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ قارئین اسے مفید پائیں گے۔ اللہ جل شانہ علامہ اسد مرحوم کی اس علمی و تحقیقی کاوش کو قبولیت کی خلعت سے سرفراز فرمائے اور توشۂ آخرت بنائے اور مترجم موصوف کو اِس علمی خدمت کے سرانجام دینے پر اجر عظیم سے سرفراز فرمائے۔

پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن
ڈائریکٹر جنرل، دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

دیباچہ

دورِ جدید کا انسان جتنی ذہنی بے چینی کا شکار ہے اس کی نظیر تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی۔ آج ہمیں نہ صرف بے شمار نت نئے مسائل کا سامنا ہے جن کا حل ہمیں خود ہی تلاش کرنا ہے بلکہ سوچ کے زاویے جن سے ہم ان مسائل کو دیکھ رہے ہیں وہ بھی پہلے سے قطعی مختلف ہیں۔ پوری دنیا میں معاشرہ بنیادی تبدیلیوں سے گزر رہا ہے۔ اس تبدیلی کی رفتار ہر جگہ مختلف ہے مگر ہر جگہ ایک زبردست قوت دیکھنے میں آتی ہے جو ہمیں ذرا رکنے یا سنبھلنے کا موقع نہیں دیتی۔

دنیائے اسلام سے بھی پرانی روایتیں اور رسوم و رواج بتدریج غائب ہوتے جا رہے ہیں اور نئے طور طریقے سامنے آ رہے ہیں۔ یہ تبدیلی دنیائے اسلام اور مسلمانوں کو کس سمت لے جا رہی ہے؟ اس کی گہرائی اور وسعت کیا ہے؟ اور یہ ارتقاء کہاں تک اسلام کے بنیادی پروگرام سے مربوط ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب اس مختصر کتابچے میں پیش نہیں کیا جا سکتا بلکہ مختصراً ان رجحانات پر بحث کی جائے گی جو آج کے مسلمان کو مغربی ثقافت کے حوالے سے اپنانے چاہییں۔ موضوع کی ہمہ گیریت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی بحث میں اسلام کے بنیادی پہلوؤں کا احاطہ کریں جس میں سُنت کا ایک مقام ہے۔ ایک مختصر سی کتاب میں اس موضوع کا صرف خاکہ ہی دیا جا سکتا ہے۔ البتہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ خاکہ ان لوگوں کے لیے جو اس موضوع پر مزید غور و فکر کرنا چاہیں محرک کا کام دے سکتا ہے۔

کچھ اپنے بارے میں: مسلمانوں کو یہ جاننے کا حق ہے کہ ایک نومسلم کیوں اور کیسے حلقہ اسلام میں داخل ہوا؟ لہٰذا یہاں میں مختصر طور پر اپنا تعارف بھی کرا دوں تو بہتر ہوگا۔ میں نے کچھ سرکردہ بین البراعظمی جریدوں کی نمائندگی کی غرض سے اپنا آبائی وطن آسٹریا ۱۹۲۲ء میں چھوڑا۔ اس سلسلے میں مجھے افریقہ اور ایشیاء کے ممالک کے سفر کا موقع ملا۔ تب سے میری زندگی کا باقی حصہ

مشرقی اسلامی ممالک میں بسر ہوا۔ یہاں میں نے مغرب کے مقابلے میں ایک مختلف سماجی نظام دیکھا۔ یہ نظام مجھے پہلی ہی نظر میں پسند آ گیا۔ اس میں موجود سکون نے مجھے متاثر کیا۔ یہاں مجھے مغربی مشینی زندگی کے مقابلے میں انسانی نقطۂ نظر سے واسطہ پڑا۔ میرے دل میں ایک جستجو سی پیدا ہوئی کہ یہ فرق کیوں ہے؟ اور پھر میں دینِ اسلام میں دلچسپی لینے لگا۔ لیکن یہ دلچسپی اتنی زیادہ نہ تھی کہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا۔ البتہ مجھ پر ایک ایسے معاشرے کے در ضرور کھل گئے جس میں اندرونی خلفشار بہت کم اور برادرانہ احساسات خاصے زیادہ تھے۔ افسوس کہ آج عملی زندگی میں مسلمان ان تعلیمات سے بہت دور ہو گئے ہیں جن کی تعلیم انہیں دینِ اسلام دیتا ہے۔ اسلام نے تحریک اور ترقی کا درس دیا تھا۔ مسلمانوں نے اسے سستی اور تنزّل میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسی طرح فراخ دلی اور ایثار کے جذبے کو تنگ نظری اور سہل پسندی سے بدل دیا گیا ہے۔ ماضی اور حال کے اس تضاد سے ایک طرف مجھے حقیقت احوال سے آگہی ملی اور دوسری طرف موجودہ حالات پر سخت کوفت ہوئی۔ یوں ماضی اور حال کے اس تضاد نے مجھے دو طرح سے نوازا۔ اب میں نے اس مسئلے پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا۔ غور و فکر کی اس شعوری کوشش کے نتیجے میں مجھے محسوس ہوا کہ میں دائرہ اسلام سے باہر نہیں بلکہ اس کے اندر ہوں۔ مسلمانوں کے مضبوط نظام عقائد و تعلیمات کے باوجود مسلمان انحطاط کا شکار کیوں؟ اس مسئلہ پر سوچ بچار کرنے سے اس کی حقیقت مجھ پر منکشف ہوگئی۔ میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ مسلمانوں کے سماجی اور ثقافتی زوال کا اصل سبب صرف اور صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کی روح کو بتدریج عمل سے خارج کر دیا ہے۔ اسلام تو ابھی تک موجود ہے مگر یہ محض ایک جسد بے روح ہے۔ وہی عنصر جو کل تک مسلمانوں میں قوت کا سرچشمہ تھا آج ان کی کمزوری کا سبب ہے۔ اسلامی معاشرہ اپنی ابتدا ہی سے مذہبی بنیادوں پر استوار ہے اور ان بنیادوں کی کمزوری نے ثقافتی ڈھانچے کو کمزور کر دیا ہے جو بالآخر اس کی تباہی کا موجب بھی بن سکتا ہے۔

اسلام کی تعلیمات نے مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے پر مجبور کیا کہ آخر کیوں

مسلمانوں نے اسلام کو عملی زندگی سے خارج کر دیا ہے۔ میں نے یہ سوال لیبیا اور پامیر کے صحراؤں اور باسفورس اور بحرِ عرب کے درمیان موجود بڑے بڑے مفکرین اسلام سے کیا۔

یہاں تک کہ یہ سوال، سوال واحد بن کر میرے ذہن پر مسلط ہو گیا۔ بتدریج یہ سوال مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں، بحیثیت ایک غیر مسلم، مسلمانوں کے ساتھ گفتگو کرتا ہوا ایک ایسے موڑ پر پہنچ گیا جہاں میں مسلمانوں کی کاہلی اور جہالت کے برعکس اسلام کا دفاع کرنے لگا۔ یہ ارتقاء غیر محسوس طور پر واقع ہوا۔ ایک دن ۱۹۲۵ء کے موسمِ خزاں میں افغانستان کے پہاڑوں میں ایک نوجوان گورنر نے مجھ سے کہا "مگر تم تو مسلمان ہو، بات صرف یہ ہے کہ تم جانتے نہیں" مجھے اس کی بات سے ایک دھچکا لگا مگر میں خاموش رہا۔ پھر جب میں دوبارہ یورپ آیا تو میں اپنے رجحان کے منطقی انجام تک پہنچ گیا اور مسلمان ہو گیا۔

یہ ہیں مختصراً وہ حالات جن میں، میں مسلمان ہوا۔ تب سے اب تک یہ سوال مجھ سے بارہا پوچھا گیا کہ تم مسلمان کیوں ہوئے؟ وہ کون سی بات تھی جس نے تمہیں خاص طور پر اسلام کی طرف راغب کیا؟ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میرے پاس ان سوالوں کا تسلی بخش جواب نہیں۔ یہ اسلامی تعلیمات کا کوئی خاص نقطہ نہیں تھا بلکہ ایک عظیم الشان، نا قابل بیان اخلاقی و عملی تعلیمات کا مکمل اور ہم آہنگ ڈھانچہ تھا جس نے مجھے اسلام کی طرف مائل کیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اسلامی تعلیمات کا کون سا پہلو ہے جو مجھے کسی دوسرے پہلو سے زیادہ پُرکشش معلوم ہوتا ہے۔ اسلام مجھے ایک مکمل تعمیراتی ڈھانچہ نظر آتا ہے جس کا ہر حصہ نہ صرف دوسرے حصے کو قوت عطا کرتا ہے بلکہ توازن کے ساتھ خوبصورتی بھی بخشتا ہے۔ شاید یہ احساس کہ اسلام کی ہر تعلیم اپنی جگہ پر صحیح اور ضروری ہے، مجھ پر سب سے زیادہ اثر کر گئی ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی کئی باتیں ہوں گی جن کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ معاملہ عشق کا تھا اور جذبۂ عشق نام ہے کئی جذبات کے مجموعے کا۔ اس میں ہماری خواہشات، ہماری تنہائیاں، ہمارے منصوبے، ہماری مجبوریاں، ہماری قوت اور کمزوریاں سب شامل ہیں۔ تو جہاں تک اسلام کا تعلق ہے مجھ پر ایک لٹیرے کی طرح حاوی ہوا جو

کسی گھر میں رات کے اندھیرے میں آہستگی سے داخل ہوتا ہے مگر برخلاف لٹیرے کے وہ وہاں بجا طور پر ٹھہرنے کے لیے آیا تھا۔ تب سے آج تک میں نے اسلام کے بارے میں وہ کچھ سیکھنے کی کوشش کی جو میں سیکھ سکتا تھا۔ میں نے قرآن پاک اور حدیثِ رسولؐ کا مطالعہ کیا۔ میں نے اسلام کی زبان کا مطالعہ کیا اور اس کی تاریخ کو پڑھا اور وہ کچھ پڑھا جو اسلام کی موافقت اور مخالفت میں لکھا گیا تھا۔ تقریباً پانچ سال حجاز مقدس میں گزارے۔ زیادہ تر مدینہ میں رہا تا کہ میں اس اصل کیفیت اور اس ماحول کی کوئی جھلک پا سکوں جس میں رسولؐ نے اسلام کی تبلیغ فرمائی۔ چونکہ حجاز مختلف ممالک سے آنے والے مسلمانوں کا مرکزی مقام ہے، اس لیے مجھے یہ موقع ملا کہ میں مختلف سماجی اور دینی نقطہ ہائے نظر سے باخبر ہو سکوں جو آج کی اسلامی دنیا میں موجود ہیں۔ اس تقابلی مطالعے نے مجھ پر ایک بات شدت سے واضح کر دی کہ مسلمانوں کی تمام کمزوریوں کے باوجود اسلام آج بھی روحانی اور معاشرتی طور پر ایک بڑی قوت کی حیثیت سے انہیں آگے لے جانے کی صلاحیت لیے ہوئے ہے اور یہ قوت انسانیت کو ملنے والی تمام قوتوں سے زیادہ طاقتور ہے اور اس کے بعد میری توجہ اس قوت کی جلا پر صرف ہونے لگی۔

یہ چھوٹی سی کتاب ایک عاجزانہ پیشکش ہے۔ اس عظیم مقصد کے لیے، اس کے مکمل طور پر غیر جذباتی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس مقدمہ کی روداد ہے جو اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان بپا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے نہیں لکھی گئی جو اسلام کو مختلف معاشرتی ضرورتوں میں سے ایک سمجھتے ہیں بلکہ ان کے لیے ہے جن کے دل میں اسلام کے لیے محبت کے شعلے کی ذرا سی بھی چنگاری باقی ہو۔ اس شعلے کی جو صحابہ کے دلوں کو گرماتا تھا اور وہ شعلہ جس نے اسلام کو ایک عظیم معاشرتی نظام بنایا اور اسے کامرانی عطا کی۔

محمد اسد

باب اول

شارعِ اسلام، ایک کشادہ شاہراہ

خلا کی تسخیر آج کے دور کا مسلمہ کارنامہ ہے۔ ایسے ذرائع ترسیل وابلاغ کا ارتقاء ہوا ہے جو پچھلی نسلوں کے خواب وخیال میں بھی نہ تھے اوران ذرائع نے سامان کی رسد ونقل اتنی تیز کردی ہے جتنی کہ انسانی تاریخ میں کبھی بھی نہیں رہی۔ اس ارتقاء کا ایک نتیجہ قوموں کے ایک دوسرے پر انحصار کی شکل میں سامنے آیا۔ کوئی قوم یا قبیلہ آج کی دنیا میں دوسروں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ معاشی ترقی بھی مقامی نہیں رہی۔ اس کا کردار بین الاقوامی ہوگیا ہے۔ اپنے رجحان میں یہ سیاسی اور جغرافیائی بندشوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ یہ اپنے ساتھ اشیاء کے علاوہ افکار اور ثقافت کا پرچار بھی کرتی ہے جو مادی اشیاء سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ اگرچہ معاشی وثقافتی ارتقاء ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن ان دونوں کی حرکی قوتوں میں فرق ہے۔ معاشی قوانین کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ اشیاء کا تبادلہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایک قوم ہمیشہ خریدار یا دکاندار نہیں رہ سکتی بلکہ دونوں طرف یہ کردار بالواسطہ یا بلاواسطہ تبدیل ہوتے رہیں گے تاکہ معاشی قوتیں کارفرما رہیں۔ مگر ثقافتی میدان میں یہ قانون لازمی طور پر لاگو نہیں ہوتا۔ اس میں یہ ضروری نہیں کہ کچھ دے کر ہی کچھ لیا جائے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اقوام جو سیاسی اور معاشی میدان میں زیادہ طاقتور ہوں ان میدانوں میں کوئی دباؤ قبول کیے بغیر کمزور اقوام پر عقلی اور معاشرتی دباؤ ڈالتی ہیں۔ یہی صورت حال آج مغرب اور اسلامی دنیا کے مابین موجود ہے۔

تاریخی نقطۂ نگاہ سے مغرب کا یک طرفہ اثر ورسوخ اسلامی دنیا پر کوئی تعجب خیز نہیں ہے کیونکہ یہ ایک طویل تاریخی عمل کا نتیجہ ہے جس کی کئی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ ہم ایک مؤرخ

کی طرح اس سلسلے میں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمارے لیے کئی معاملات غور طلب ہیں۔ ہم اس کھیل میں محض تماشائی نہیں۔ ہم، جو اپنے آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار قرار دیتے ہیں یہ یقین رکھتے ہیں کہ اسلام دوسرے مذاہب کے برخلاف نہ صرف ایک روحانی رجحان ہے جو کہ دوسری ثقافتوں کے ساتھ مل کر رہ سکتا ہے بلکہ یہ ثقافتی اور سماجی نظام کی ایک مربوط اور متعین شکل ہے۔

جب کسی بیرونی تہذیب کی، جیسا کہ آج کل صورتحال ہے، شعاعیں ہم تک پہنچتی ہیں اور ہماری ثقافت میں تبدیلیوں کا باعث بنتی ہیں تو ہم پر لازم ہوتا ہے کہ ہم اس بات کی وضاحت کریں کہ وہ اثرات ہمیں ہماری اپنی متعین کردہ سمت میں لے جا رہے ہیں یا اس کے خلاف، آیا یہ تریاق کا کام کر رہے ہیں یا زہرِ ہلاہل کا؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے صحیح تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ ہمیں اسلامی اور جدید مغربی تہذیب دونوں کی حرکی قوتوں کا منبع دریافت کرنا ہوگا اور پھر تحقیق کرنی ہوگی کہ کس حد تک دونوں کے درمیان تعاون ممکن ہے۔

اسلامی تہذیب بنیادی طور پر ایک دینی تہذیب ہے۔ ہمیں سب سے پہلے انسانی زندگی میں دین اسلام کے کردار کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ وہ چیز جسے ہم دینی رجحان کہتے ہیں درحقیقت انسان کی عقلی اور حیاتی ترکیب کا فطری نتیجہ ہے۔ انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ زندگی کے راز پیدائش، موت اور ابدیت کی گتھیوں کو سلجھا سکے۔ اس کی منطق ناقابل تسخیر دیواروں کے سامنے رک جاتی ہے۔ تب وہ صرف دو کام کر سکتا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ زندگی کو ایک "کُل" کے طور پر دیکھنا چھوڑ دے۔ اس صورت میں وہ صرف خارجی تجربات کا سہارا لیتا ہے اور اپنے نتائج کو انہیں خارجی تجربات تک محدود رکھتا ہے۔ اس طرح وہ زندگی کو چھوٹے چھوٹے اجزاء میں تقسیم کر کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ علمِ انسانی، علمِ فطرت کے ساتھ کبھی تیزی اور کبھی آہستگی سے بڑھتا رہتا ہے۔ تاہم یہ علم، اجزاء تک ہی محدود رہتا ہے اور زندگی کا مجموعی علم انسانی شعور کے عقلی پیمانوں سے باہر ہی رہتا ہے جبکہ علم سائنس اسی ڈگر پر رواں دواں رہتا ہے۔ ایک امکان اور بھی ہے جو علم

سائنس کے ساتھ ساتھ چل سکتا ہے۔ یہ دین کا طریقہ ہے جو انسان کی رہنمائی، وجدانی تجربات سے کرتا ہے اور زندگی کی مجموعی وضاحت کرتا ہے اس میں ایک عظیم ترین تخلیق کرنے والی ہستی کا وجود بنیادی مفروضہ ہے جو کائنات پر پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حکومت کرتی ہے اور انسانی عقل وادراک سے بالاتر ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے یہ تصور انسان کو حقائق اور انسانی زندگی کے خارجی مشاہدات کے علم سے خارج نہیں کرتا۔ خارجی (سائنسی) اور داخلی (دینی) علوم میں کوئی تصادم نہیں۔ یہ وہ واحد امکانی سوچ ہے جو پوری زندگی کا متوازن اور ہم آہنگ طور پر احاطہ کرسکتی ہے۔

گو کہ ہم آہنگی کا لفظ اکثر غلط طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر اس صورت میں بہت اہم ہے کیونکہ یہ خود انسان میں ایک موافق رجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو کچھ انسان کے اپنے نفس میں یا ان بیرونی اور اندرونی قوتوں کے درمیان وقوع پذیر ہوتا ہے کسی اندھے کھیل کا نتیجہ کبھی نہیں ہوسکتا جو بے شعور اور بے ارادہ قوتوں کے درمیان کھیلا جارہا ہو۔ علم دین اسے اللہ کے شعوری ارادے کا نتیجہ سمجھتا ہے جو باقاعدہ ترتیب دیئے گئے کائناتی پروگرام کا حصہ ہے۔ اس طرح وہ ان تلخیوں کو سمجھنے کے قابل ہوجاتا ہے جو اس کے نفس اور خارجی دنیا یا مظاہر فطرت کے درمیان موجود ہیں۔ سوچ کی بے یقینیاں، خواہشات، احساسات اور خوف انسان کو فطرت کے مدمقابل لے آتے ہیں۔ فطرت کی گتھیاں زیادتی اور ظلم، خطرات اور حفاظت ایک عجیب وغریب اور ناقابلِ وضاحت انداز میں الجھی ہوئی ہیں۔ اس کا طرزِ عمل انسانی ذہن سے قطعاً مختلف ہے۔ عقل، فلسفہ اور تجرباتی سائنس ان مسائل کا حل دینے میں کبھی کامیاب نہیں رہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مذہب داخل ہوتا ہے۔

دینی شعور کی روشنی میں انسان ناطق اور غیر ناطق اور ظاہری طور پر بے پرواہ فطرت کو ایک روحانی آسودگی کے رشتے میں منسلک کرتا ہے۔ اس لیے کہ انسانی شعور اور داخلی وخارجی فطرت آپس میں مربوط ہیں اور اختلاف کے باوجود یہ ایک ہی خالق کے تخلیقی ارادے کا مظہر

ہیں۔ اس طرح دین انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ باقاعدہ منصوبہ کے تحت پیدا کردہ ہے اور ایک ابدی تخلیقی تحریک کا حصہ ہے جو لامتناہی کائناتی تقسیم کی ایک کڑی ہے۔ اس تصور کا نفسیاتی نتیجہ احساس تحفظ کی شکل میں سامنے آتا ہے جو خوف اور امید کے درمیان ایک مثبت توازن کا باعث بنتا ہے۔ یہی احساس تحفظ مذہبی شخص کو لادین لوگوں سے ممتاز کرتا ہے خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو۔

تمام مذاہب اپنی خصوصی تعلیمات میں اختلاف کے باوجود اپنی اخلاقی تعلیمات میں انسان کو اپنی رضا پر اللہ کی رضا کو فوقیت دینے اور اس کی تعلیمات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ مگر اسلام اور صرف اسلام محض نظریاتی دعوت و وعظ سے آگے بڑھ کر ہمیں نہ صرف یہ سکھاتا ہے کہ زندگی ایک اکائی ہے جس کا آغاز الہامی وحدت سے ہوتا ہے بلکہ یہ عملی تعلیم بھی دیتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی ایک انفرادی وحدت کا مالک ہے۔

اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے نہ ترک دنیا کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی خفیہ دروازے کا وجود ہے جو روحانی طہارت کے لیے کھولا جاتا ہو۔ اس طرح نجات کے لیے ناقابل فہم نظریات کو آنکھ بند کر کے ماننے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ یہ تمام چیزیں اسلام میں نہیں ہیں۔ کیونکہ نہ تو یہ تصوف ہے اور نہ ہی فلسفہ۔ یہ زندگی کا ایک نظام ہے جو اللہ تعالی نے اپنی مخلوق کو فطرت کے مطابق عطا کیا ہے۔ اس کی بڑی کامیابی روح اور مادے کے مکمل امتزاج میں ہے۔ اسلامی تعلیمات میں ان دونوں کو یکجا کیا گیا ہے کہ جِسمانی اور اخلاقی وجود میں کوئی تصادم پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان میں حقیقی ملاپ اور تعاون پیدا کیا جاتا ہے جو کہ زندگی کی فطری بنیاد ہے۔

میرے خیال میں نماز کی ایک خاص شکل متعین کرنے کی وجہ یہی ہے کہ اس میں روحانی توجہ اور جسمانی حرکات کو آپس میں ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔ اکثر ناقدین اسلام نماز کی حرکات پر اعتراض کرتے ہوئے اسے نمائش قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام نمائشی مذہب ہے جو خارجیت پر زور دیتا ہے۔ درحقیقت دوسرے مذاہب کے لوگ جو جسم اور روح کو دودھ سے مکھن

کی طرح الگ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں یہ سمجھنے سے عاری ہیں کہ اسلام کے دودھ میں یہ دونوں اجزاء اپنی امتیازی خصوصیات بحال رکھے ہوئے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں نماز اس لیے ذہنی ارتکاز اور جسمانی حرکات پر مشتمل ہے کہ انسانی زندگی بذاتِ خود انہی دونوں کے مرکب کا نام ہے اور ہم پر واجب ہے کہ اللہ کے حضور تمام ودیعت کردہ صلاحیتوں اور خصوصیات کے ساتھ حاضر ہوں۔

اس کی دوسری مثال کعبہ کے گرد طواف میں پنہاں ہے۔ یہ ہر اس شخص پر لازم ہے جو اس پاک شہر میں داخل ہوتا ہے کہ وہ سات پھیروں اس گھر کا طواف کرے۔ یہ حج کے تین اہم ارکان میں سے ایک ہے۔ تو یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا عبادت کا اس طرح رسمی اظہار ضروری ہے؟ اور یہ کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ جب ہم کسی شے کے گرد گھومتے ہیں تو وہ دراصل ہمارے اعمال کا مرکز و محور ہوتی ہے۔ قبلہ جس کی طرف رخ کر کے مسلمان نماز پڑھتے ہیں اللہ کی وحدانیت کی نشاندہی کرتا ہے اور حج کی جسمانی حرکات انسانی زندگی کا علامتی اظہار ہیں۔ طواف ہماری پرستش ہی نہیں بلکہ ہماری عملی زندگی، ہمارے اعمال اور ہماری جدوجہد کا مرکز اللہ تعالیٰ کو قرار دیتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذّٰریٰت ۵۱:۵۶)

''ہم نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے''۔

اس طرح اسلام میں عبادت کا تصور دوسرے مذاہب سے مختلف ہے۔ یہاں یہ صرف نماز و روزہ تک محدود نہیں بلکہ پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔ اگر ہماری زندگی کا مقصد اللہ کی عبادت ہے تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ زندگی اور اس کے تمام پہلوؤں کو ایک مربوط اخلاقی ذمہ داری سمجھیں۔ اس طرح ہمارے تمام اعمال چاہے وہ ظاہراً کتنے ہی چھوٹے کیوں نہ ہوں عبادات کی طرح ہونے چاہییں یعنی انہیں اللہ تعالیٰ کے کائناتی نظام کا حصہ بنا چاہیے۔ یہ حالت عام آدمی کے لیے ایک خیالی بات سے زیادہ نہیں مگر دین کا مقصد ہی عالم خیال کو عالم وجود میں لانا

ہے۔

اسلام دیگر مذاہب سے قطع نظر ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہر ہر عمل میں اللہ کی عبادت ہی دراصل زندگی کا مقصد ہے اور یہ کہ اس مقصد کا حصول اس وقت ناممکن ہو جاتا ہے جب ہم زندگی کو روح اور مادہ میں تقسیم کرتے ہیں۔ اللہ کی وحدانیت کے بارے میں ہمارا نظریہ، ہماری ذات کے مختلف پہلوؤں کے درمیان ہم آہنگی اور اتحاد سے منعکس ہونا چاہیے۔

اسلام اس رجحان کے منطقی نتیجہ کے طور پر دوسرے ادیان سے مختلف ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس ضمن میں اسلام کا نقطۂ نظر نہایت معقول اور جامع ہے۔ اس میں اولاً یہ تعلیم ہے کہ انسانی زندگی کا اصل مقصد ہمہ وقت اور ہمہ جہت اللہ کی عبادت ہے اور ثانیاً یہ کہ یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوگا جب تک ہم زندگی کو مادی اور روحانی خانوں میں بانٹتے رہیں گے۔ درحقیقت انہیں یکجا ہونا چاہیے۔ دینِ اسلام میں دنیاوی زندگی کو آخرت کا بے معنی خالی خولی سایہ نہیں گردانا جاتا بلکہ ایک مثبت اکائی سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات نہ صرف ایک اکائی ہے بلکہ ایک مقصد بھی ہے۔ اسی طرح اس کی مخلوق بھی اپنے جوہر اور اپنے مقصد کے لحاظ سے ایک اکائی ہے۔ اس تصور کو اپنے ذہن میں جاگزین رکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اللہ کی عبادت اپنے وسیع معنوں میں زندگی کے اصل مقاصد سے روشناس کراتی ہے۔ تمام دینی نظاموں میں صرف اسلام فرد کی تکمیل اس کے زمینی وجود کے ساتھ ممکن بناتا ہے۔ اسلام فرد کی پختگی کو عیسائیت کی طرح جسمانی خواہشات کے دبانے سے مشروط نہیں کرتا اور نہ ہی اسے ہندو مذہب کی طرح ایک زنجیر کی شکل دیتا ہے جس میں پیدائش کے بعد دوبارہ پیدائش کا وعدہ اور اگلے مقام تک رسائی ہوتی ہے۔ نہ ہی بدھ مت کی طرح ذات کی فنا پر یقین رکھتا ہے۔ جس میں دنیا کے ساتھ ہر جذباتی تعلق کو ختم کر لیا جائے۔ نہیں، اسلام بڑی تاکید کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ انسان اپنے تمام دنیاوی امکانات کا مکمل استعمال کرتے ہوئے اپنے زمینی وجود و حیات کے ساتھ پختگی کو پہنچ سکتا ہے۔

تمام انسانوں سے ایک طرح کی جدوجہد برائے تکمیل کی توقع رکھنا ایسی ہی حماقت ہوگی جیسے ریگستانی اور ریس کے گھوڑوں میں یکساں خصوصیات تلاش کی جائیں۔ دونوں انفرادی طور پر مکمل اور اطمینان بخش مگر لازماً مختلف ہوں گے کیونکہ ان کا بنیادی کردار مختلف ہوگا۔ انسان کے ساتھ بھی یہی صورتحال ہے۔ اگر تکمیل کا ایک ہی معیار مقرر کر دیا جائے جیسا کہ عیسائیت میں تارک الذات کا تصور ہے، تو انسانوں کو اپنی خصوصیات کو چھوڑنا، بدلنا اور دبانا ہوگا اور اپنی انفرادیت کو ختم کرنا پڑے گا جو قدرتی قوانین کے خلاف ہوگا۔

اس کے لیے اسلام جبر و تشدد سے کام نہیں لیتا بلکہ انسان کو ایک بہت بڑا میدان فراہم کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنے شخصی اور سماجی وجود کو جلا بخش سکتا ہے تاکہ شخصیتوں کے مختلف نفسیاتی رجحانات کا مثبت ارتقاء انسان کی اپنی انفرادی رغبت کے مطابق ہو سکے۔ وہ ترکِ دنیا کا راستہ اختیار کرے یا زندگی کے تمام حسی امکانات سے لطف اندوز ہو مگر یہ سب قانون کے اندر رہتے ہوئے ہو۔ ایک خانہ بدوش جو صحراؤں میں گھومتا ہو جس کے پاس کل کی غذا نہ ہو اور ایک امیر تاجر جو مال و متاع سے گھرا ہوا ہو۔ جب تک وہ خلوص و شعور کے ساتھ اللہ کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کیے رکھتا ہے اسے آزادی ہے کہ اپنی ذاتی زندگی کو اپنی فطرت کے مطابق جس سانچے میں ڈھالنا چاہے ڈھال لے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ قدرت کی عطا کردہ نعمت حیات سے بھرپور فائدہ اٹھائے اور اپنے ارتقاء سے اپنے ساتھی انسانوں کی روحانی سماجی اور مادی جدوجہد میں ان کی مدد کرے۔ مگر اس کی انفرادی زندگی کسی خاص معیار کی تابع نہیں۔ وہ آزاد ہے کہ بے حساب جائز امکانات میں سے اپنے راستے کا انتخاب کرے۔

اس فراخ دلی کی بنیاد اسلام کے اس تصور میں ہے کہ انسان فطرتاً نیک ہے۔ اس کے برعکس عیسائیت کا تصور یہ ہے کہ انسان گنہگار پیدا ہوا ہے یا پھر ہندومت کی تعلیمات کہ انسان ناپاک اور نیچ پیدا ہوا ہے اور اسے تکمیل کے لیے پیدائش اور اموات کے کئی سلسلوں سے گزرنا ہے۔ اسلامی تعلیمات کہتی ہیں کہ انسان پاک پیدا ہوا ہے اور امکانی طور پر مکمل ہے۔ قرآن فرماتا

ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین ۹۵:۴)

''یقیناً ہم نے انسان کو بہترین حالت میں بنایا'' ؎

اسی سانس میں ساتھ ہی یہ آیت کہتی ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ. اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

(التین ۹۵:۵۔۶)

''اور پھر ہم اسے بدلتے ہیں بدترین میں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں''۔

اس سورت میں اس تعلیم کی وضاحت کی گئی ہے کہ انسان بنیادی طور پر نیک ہے اور مزید برآں یہ کہ کفر اور بدعملی اس کی بنیادی کاملیت کو تباہ کر دیتی ہیں۔ دوسری طرف انسان کو اختیار ہے کہ وہ اپنی انفرادی تکمیل کو بحال کر لے اور یہ اس شعوری کوشش پر منحصر ہے کہ وہ اللہ کی وحدانیت کا احساس کرے اور اس کے قوانین کو مانے۔

فلسفۂ اسلام نہ تو برائی کو ضروری قرار دیتا ہے اور نہ ہی بنیادی بلکہ یہ تصور دیتا ہے کہ برائی دراصل اندرونی مثبت قوتوں کے غلط استعمال کے بعد رونما ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے یہ خصوصیات ہر فرد میں مختلف مگر مکمل ہوا کرتی ہیں۔ ان قوتوں کا مکمل ارتقاء انسانی زندگی میں ممکن ہے۔ ہم یہ بات یقینی سمجھتے ہیں کہ حیات بعد الموت میں چونکہ تصورات و احساسات مکمل طور پر مختلف ہوں گے اس لیے وہ انسانی روح کو مزید ارتقاء کی منازل سے گزاریں گے مگر یہ مستقبل کی باتیں ہیں۔ اس دنیاوی زندگی میں اسلامی تعلیمات ہمیں کاملیت حاصل کرنے کا راستہ دکھاتی ہیں۔

تمام مذاہب عالم کے مقابلے میں اسلام ہی وہ دین ہے جو انسان کے روحانی ارتقاء کے ساتھ اسے دنیاوی زندگی سے مکمل طور پر لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ تصور

عیسائیت سے بہت مختلف ہے جس کے مطابق انسانیت آدم اور حوا کے گناہ تلے دبی ہوئی ہے، جس کے نتیجے میں زندگی (کم از کم نظریہ کی حد تک) ایک غم ناک کہانی کا روپ دھار لیتی ہے۔ زندگی کو برائی اور بھلائی کے مابین میدان جنگ تصور کیا جاتا ہے۔ برائی کی قوت شیطان کی اور بھلائی کی عیسیٰ مسیح کی۔ شیطان جسمانی لالچ دے کر انسانی روح کو ارتقاء اور حیاتِ ابدی سے روکتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق روح پر عیسیٰ مسیح اور جسم پر شیطان کا قبضہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں مادہ کی دنیا پر شیطان کی سلطنت ہے جبکہ روح کی دنیا الہامی ہے اور اچھی ہے۔ ہر وہ چیز جو انسانی فطرت میں جسم یا لذات سے متعلق ہے وہ بلا واسطہ جرم آدم کے نتیجے میں ہے اور یہ جہنم کے مادی شہزادے کے حکم پر کیا گیا ہے۔ اسی لیے نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ اس گوشت پوست کی دنیا سے نجات حاصل کی جائے اور مستقبل کی روحانی دنیا پر نظر رکھی جائے جہاں عیسیٰ مسیح نے صلیب پر جان دے کر تمام انسانی گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ چاہے اس تعلیم کو عملاً کبھی نہ مانا گیا ہو، اس کا وجود مذہبی انسانوں میں مستقلاً ایک احساسِ گناہ پیدا کرتا ہے۔ وہ ترکِ دنیا اور خواہشاتِ نفسانی کے درمیان پھنس جاتا ہے۔ ایک طرف وہ ناکردہ گناہ ہے جس کی زک سے بچنا ناممکن ہے اور دوسری طرف زندگی گذارنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی خواہش ___ اس طرح مسیح کے ذریعے سے نجات انسانی کی روحانی خواہشات، اسے اس کے جائز اور قانونی حقوق کے حصول سے روک دیتی ہیں۔

اسلام ہمیں ایسے کسی بنیادی گناہ کا سبق نہیں دیتا۔ اللہ کے انصاف و عدل کے مطابق ہم اسے غیر متعلق سمجھتے ہیں۔ اللہ تو بچے کو اس کے باپ کے گناہ کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا تو پھر وہ کیونکر بے شمار انسانوں کو آدم کی نافرمانی کا ذمہ دار ٹھہرا سکتا ہے۔ بے شک اس گتھی کا فلسفیانہ جواب ممکن ہے مگر سیدھی سادی عقل والے عام شخص کے لیے ایسا جواب غیر اطمینان بخش اور مصنوعی ہی رہے گا۔ جیسے عقیدہ تثلیث بجائے خود عقل انسانی کو مطمئن کرنے سے قاصر ہے۔ اسلام میں چونکہ کوئی وراثتی گناہ نہیں اس لیے کسی ہمہ گیر نجات کا تصور بھی نہیں۔ نجات اور گرفت

دونوں انفرادی ہیں۔ ہر مسلمان اپنا نجات دہندہ آپ ہی ہے اور اپنی روحانی کامیابی و ناکامی کا آپ ہی ذمہ دار ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ. (البقرة ۲:۲۸۶)

''اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا اور اس کے خلاف بھی وہی ہے جو اس نے کمایا''۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا :

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى (النجم۵۳:۳۹)

''انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے''۔

مگر جہاں اسلام عیسائیت کے غم انگیز تصور حیات سے متفق نہیں وہیں ہمیں یہ تعلیم بھی دی جاتی ہے کہ ہم دنیا کو وہ مبالغہ آمیز اہمیت نہ دیں جو آج کی مغربی تہذیب اسے دیتی ہے۔ عیسائیت دنیا کو برائی سمجھتی ہے جبکہ آج کا مغرب دنیا سے ویسی ہی محبت کرتا ہے جیسی کسی پیٹو شخص کی غذا سے ہوتی ہے، وہ اسے کھاتا جاتا ہے مگر اس سے سیر نہیں ہوتا۔ اسلام دنیا کو احترام دیتا ہے لیکن وہ دنیا کی پوجا نہیں کراتا بلکہ اسے اگلے مقام پر جانے کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ مگر چونکہ یہ ایک مقام ہے اور ہے بھی ضروری مقام اسی لیے انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس سے نفرت کرے یا اس کی بے قدری کرے۔ ہمارا سفر اللہ تعالیٰ کے منصوبے کا ایک مثبت حصہ ہے۔ اسی لیے انسانی زندگی کی بڑی اہمیت ہے مگر ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ اہمیت صرف منحصر (Relative) ہے۔ اسلام میں نہ تو جدید مغرب کے اس نعرہ کی کوئی حیثیت ہے کہ ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' اور نہ اس نعرہ کی کہ ''دنیا میرے لیے نہیں'' اسلام ان دونوں میں سے درمیان کی راہ اپناتا ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (البقرة ۲:۲۰۱)

''میرے رب مجھے اس دنیا میں بھی اچھائی عطا فرما اور آخرت میں بھی''۔

معلوم ہوا کہ متاع دنیا سے فائدہ اٹھانا روح کی بالیدگی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں اور مالی خوشحالی غیر پسندیدہ نہیں، البتہ اسے مقصد نہیں بن جانا چاہیے۔ ہماری سرگرمیوں کا مقصد ایسے حالات کی فراہمی ہونا چاہیے جن کی وجہ سے ہماری اخلاقی قوتیں ترقی کریں۔ اسلام ہمیں شعوری طور پر کیے گئے اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ انجیل کی طرح ''جو سیزر کا ہے وہ سیزر کو دو'' جیسی تعلیمات کا اسلام میں کوئی مقام نہیں۔ کیونکہ اسلام ہماری اخلاقی، معاشی اور معاشرتی ضرورتوں میں کوئی رقابت تسلیم نہیں کرتا۔ ہمیں صرف غلط اور صحیح عمل کے درمیان اختیار ہے۔ ان دونوں کے بین بین کوئی شے موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عمل پر ایک ناگزیر عنصر کی حیثیت سے انتہائی زور دیا گیا ہے۔ ہر مسلمان اپنے اطراف وقوع پذیر ہونے والے اعمال کے لیے شخصی طور سے ذمہ دار ٹھہرتا ہے اس راہ میں وہ معروف کے قیام اور منکرات کے خاتمے کے لیے حتی المقدور جدوجہد کرتا ہے۔

قرآن مجید کے الفاظ ہیں:

كُنتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (ال عمران ۳:۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو جو انسانیت کے لیے بھیجی گئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو۔ اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

اسلامی جہاد کا مقصد بھی یہی ہے جس کے لیے اگر آپ توسیع پسندی کا لفظ استعمال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں ورنہ یہ توسیع پسندی نہیں کیونکہ یہ نہ تو حاکمیت کی محبت اور استعماری ارادے کے تحت شروع ہوئی، نہ ہی کوئی معاشی یا قومی غرض اس میں شامل تھی، نہ مسلمانوں نے اپنے عیش و آرام میں اضافہ کی خاطر دوسری قوموں پر یلغار کی اور نہ ہی زور بازو سے غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا گیا۔

اس کا مقصد ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ ایک ایسا ماحول فراہم کیا جائے جس میں انسان

کی بہترین روحانی صلاحیتوں کو جلا ملے۔ اخلاقی تعلیمات محض غلط اور صحیح کے درمیان کمزور شاعرانہ فرق نہیں کرتیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری عائد کرتی ہیں۔ جن تعلیمات میں حق کو آگے بڑھانے اور باطل کو دبانے کی قوت نہ ہو وہ بجائے خود بدترین، بداخلاقی ہوتی ہیں۔ اسلام میں اخلاقیات کی تعلیم انسانی کوشش اور جدوجہد کے ساتھ پروان چڑھتی اور زوال پذیر ہوتی ہے تاکہ زمین پر اس کو غلبہ حاصل ہو سکے۔

باب دوم

روحِ مغرب

پچھلے باب میں مبادیاتِ اسلام کا ایک خاکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم یہ اندازہ آسانی سے لگا سکتے ہیں کہ تہذیب اسلامی ایک مکمل دینی حکومت قائم کرتی ہے۔ یہاں مذہب کا پاس ہر چیز سے بالاتر اور برتر ہے۔ اگر ہم اس رجحان کا مغربی تہذیب سے موازنہ کریں تو یہ عظیم فرق ہمیں متاثر کیے بغیر نہیں رہتا کہ جدید مغربی تہذیب اپنی کوششوں اور سرگرمیوں میں عملی افادیت اور حرکی پھیلاؤ کی تابع ہے۔ اس کا جبلی مقصد تو زندگی کے پوشیدہ حقائق کو دریافت کرنا ہے لیکن اخلاقیات کا اس نظریہ میں کوئی مقام نہیں۔ آج کے یورپی اور امریکی شہری کے لیے مقصدِ حیات ایک بے معنی لفظ بن چکا ہے۔ یہاں جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کون کون سے رنگوں میں ڈھل سکتی ہے اور یہ کہ نسل انسانی فطرت پر قابو پانے میں کامیاب ہوسکتی ہے یا نہیں؟ آخری سوال کا جواب ہاں میں ہے اور یہاں اس کا راستہ اسلامی تعلیمات سے ملتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ (البقرۃ ۲:۳۰)

”میں دنیا میں ایک خلیفہ بنا رہا ہوں“۔

اس کے واضح معنی یہ ہیں کہ انسان کو دنیا میں حکومت کرنے اور آگے بڑھنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ مگر انسانی ارتقاء کی ماہیت پر دونوں نظریات میں فرق ہے۔ مغرب انسان کے تدریجی روحانی ارتقاء پر یقین رکھتا ہے لیکن اسلام نے کبھی یہ قبول نہیں کیا کہ انسانی فطرت پودے کی طرح لازماً بتدریج ارتقاء پا رہی ہے۔ کیونکہ روح کی بنیاد حیاتیاتی نہیں ہے۔ یورپی سوچ کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ مادی علم اور آسائش کے ارتقاء کو اخلاقی اور روحانی ارتقاء کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ اس

غلطی کی بنیاد اس وقت پڑی جب حیاتیاتی قوانین کو غیر حیاتیاتی حقائق پر لاگو کیا گیا۔ اس کی تہہ میں روح کے وجود سے صرفِ نظر کر لیا گیا۔ اسلام اپنے وجدانی تصورات کی بنیاد پر روح کو شک و شبہ سے بالاتر ایک حقیقت گردانتا ہے اگر چہ مادی اور روحانی ارتقاء متضاد نہیں مگر یہ ایک بھی ہرگز نہیں کیونکہ دونوں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر محیط ہیں اور ارتقاء کی یہ دونوں شکلیں لازماً ایک دوسرے پر منحصر نہیں ہیں۔

اسلام وضاحت کے ساتھ مادی ترقی کے امکان کو مانتا ہے اور اس کی خواہش کو تسلیم کرتا ہے مگر اتنی ہی وضاحت کے ساتھ انسانیت کی اجتماعی روحانی ترقی سے انکار کرتا ہے جو اجتماعی کامیابیوں سے حاصل کی جائے۔ روحانی ترقی کا حرکی عنصر ہر فرد تک محدود ہے اور اس اخلاقی و روحانی ارتقاء کے مدارج ہر فرد پیدائش اور موت کے درمیان طے کر سکتا ہے۔ اجتماعی راستہ سے تکمیل کی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔ ہر شخص یہ روحانی مقصد ایک فرد کی حیثیت سے حاصل کرتا ہے اور ہر شخص اپنے آپ سے ابتداء کر کے خود ہی اختتام تک پہنچتا ہے۔

روحانی قسمتوں کے بارے میں فرد کے اس طے شدہ نقطہ نظر کو ایک جاندار اسلامی معاشرہ سے متوازن کیا گیا ہے اور اس کی بلاواسطہ تصدیق کی گئی ہے۔ معاشرہ کا فرض ہے کہ ایسا نظام برپا کرے جس میں ہر فرد کو اپنے روحانی ارتقاء کے لیے مشکلات کم سے کم اور حوصلہ افزائی زیادہ سے زیادہ حاصل ہو۔ قانونِ شریعت کا تعلق انسانی زندگی کے روحانی اور مادی دونوں پہلوؤں سے ہے اور یہ انفرادی اور سماجی دونوں کرداروں سے متعلق ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ تصور انسان کے روحانی وجود اور حیاتِ انسانی کے ایک بالاتر مقصد پر کامل یقین ہی سے ممکن ہے مگر جدید مغربی نظریۂ حیات، جو روح کے وجود کو نظرانداز کرتے ہوئے اس سے تقریباً منکر ہے، کے لیے زندگی کے مقصد کا سوال کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نے بلند نظری اور آفاقی سوچ سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔

مذہبی رجحان ہمیشہ اس یقین پر مبنی ہوتا ہے کہ ایک تسلیم شدہ ماورائی اخلاقی قانون

موجود ہے اور ہم پر اس کا ماننا واجب ہے مگر جدید مغربی تہذیب معاشی اور قومی ضرورتوں کے سوا کسی قانونِ تسلیم ورضا پر یقین نہیں رکھتی۔ اس کا خدا ''آسائش'' ہے اور اس کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس زندگی کا حقیقی فلسفہ قوت بذریعہ قوت ہے۔ یہ دونوں اسے رومی تہذیب سے ورثہ میں ملی ہیں۔

جدید مغربی تہذیب کے نظریہ مادیت کا ذمہ دار سلطنتِ روم کو ٹھہرانا (چاہے بہت ہی ابتدائی حیثیت ہی میں کیوں نہ ہو) کچھ لوگوں کے لیے تعجب کا باعث ہوگا۔ خاص طور سے ان لوگوں کے لیے جو اکثر اسلامی اور رومن سلطنت کی مماثلت کے بارے میں سنتے آرہے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے بنیادی تصورات اور جدید مغربی تہذیب کے درمیان اتنا زبردست تضاد کیسے ممکن ہے جبکہ ماضی میں دونوں کے سیاسی نظریات قریب قریب ہی تھے۔ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ ایسا کبھی بھی نہ تھا۔ یہ عام تقابل جس کا ذکر اکثر ہوتا ہے ان تاریخی غلطیوں میں سے ایک ہے جن سے سطحی سائنس آج کی نسل کی آبیاری کرتی ہے۔ اسلام اور سلطنت روم کے درمیان کوئی بھی قدر مشترک نہیں سوائے اس کے کہ دونوں سلطنتیں مختلف اقوام اور وسیع جغرافیائی حدود پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دونوں سلطنتیں مکمل طور پر مختلف اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے تیار تھیں اور دونوں کی محرک قوتیں الگ تھیں۔ دوسرے لفظوں میں مختلف تاریخی مقاصد لیے ہوئے تھیں۔ اگر ہم دونوں کی ہئیت ترکیبی (Morphology) کے اعتبار سے بھی دیکھیں تو ہمیں دونوں سلطنتوں میں عظیم فرق نظر آئے گا۔ رومن سلطنت کو اپنی مکمل جغرافیائی وسیاسی حیثیت حاصل کرنے میں پورا ایک ہزار سال کا عرصہ لگا۔ جبکہ اسلامی سلطنت صرف اسّی (۸۰) سال کے مختصر عرصے میں اپنی کامل شکل میں آگئی۔ جہاں تک زوال کا معاملہ ہے وہ بھی سینوں کو منور کرنے کے لیے کافی ہے۔ رومیوں کا زوال جو ھن اور گاتھ کی ہجرت سے تکمیل کو پہنچا، تقریباً ایک صدی کے اندر اندر واقع ہوگیا اور اتنا مکمل ہوا کہ کتابوں اور آثارِ قدیمہ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا۔ بازنطینی سلطنت جو عام طور پر رومن سلطنت کی واحد وارث سمجھی جاتی ہے وہ بھی صرف اس حد تک وارث

تھی کہ اس کا انہی علاقوں پر حکم چلتا تھا جو کبھی رومن سلطنت کا حصہ تھے۔ اس کے علاوہ سماجی ڈھانچہ اور سیاسی تنظیم کے لحاظ سے وہ کسی طرح بھی رومن سلطنت سے میل نہ کھاتی تھی۔ دوسری طرف اسلامی سلطنت کا طویل دورانیہ جس کی ابتداءً خلفائے راشدین کے دور سے ہوئی بڑے بگاڑ اور تبدیلیوں سے گزرنے کے باوجود اپنا بنیادی ڈھانچہ برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔

جہاں تک خارجی حملوں کا تعلق ہے منگولوں کے حملے جو رومن سلطنت پر ہونے والے ھن اور گاتھ کے حملوں سے زیادہ خطرناک تھے، مسلمانوں کے سیاسی وجود اور سیاسی تنظیم کو نہ ہلا سکے (گو کہ یہی بعد میں پیدا ہونے والے معاشی اور عقلی ٹھہراؤ کا سبب تھے)۔ سلطنتِ روم کے مقابلے میں اسلامی سلطنت کا زوال ہزار درجہ آہستگی سے واقع ہوا۔ وہاں ایک صدی میں ہی اختتام اور یہاں یہ زوال عثمانی سلطنت کے زوال کے ساتھ چودہویں صدی ہجری میں واقع ہوا جس کے بعد سماجی انتشار کا وہ عمل شروع ہوا جس کے ہم آج شاہد ہیں۔

یہ باتیں ہمیں اس نتیجہ کی طرف لے جاتی ہیں کہ اسلامی دنیا کی داخلی قوت اور سماجی مضبوطی انسانیت کو ملنے والے کسی بھی سماجی نظام کی قوت سے زیادہ ہے۔ خواہ وہ چینی تہذیب ہی کیوں نہ ہو۔ اس تہذیب نے بھی بلاشبہ کئی صدیوں سے اسی طرح کی قوت مزاحمت کا اظہار کیا ہے۔ چین براعظم کے ایک سرے پر واقع ہونے کی وجہ سے کسی دوسری مخالف قوت کی پہنچ سے باہر تھا، منگولوں سے جنگ کے دوران چنگیز خان اور اس کے ساتھیوں نے چین کے مختصر سے ٹکڑے سے زیادہ کو نہ چھوا جبکہ اسلامی سلطنت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اور ہر وقت طاقتور دشمنوں سے گھری ہوئی تھی۔ ابتدائے تاریخ سے مشرق قریب اور مشرقِ وسطی نسلی و ثقافتی قوتوں کے آتش فشاں مرکز رہے ہیں مگر اسلامی تہذیب ماضی قریب تک ناقابل تسخیر دیوار بنی رہی ہے۔ اس عظیم واقعہ کی وضاحت کے لیے ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ قرآن کی دینی تعلیم تھی جس نے اس سماجی ڈھانچے کو ٹھوس بنیادیں عطا کیں اور یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات تھیں جنہوں نے اسے فولادی خول عطا کیا۔ رومن سلطنت کے پاس ایسا کوئی روحانی عنصر نہ تھا جو

اس کے سماجی ڈھانچے کو قائم رکھ سکتا، اسی لیے وہ اتنی تیزی سے ٹوٹ گیا۔

ان دونوں سلطنتوں کے درمیان ایک اور واضح فرق ہے۔ اسلامی سلطنت میں کوئی قوم خصوصی مرتبہ کی حامل نہ تھی اور قوت کو ایک ایسے نظریہ کی تبلیغ کے لیے وقف کر دیا گیا تھا جسے اس کے رہنما دینی سچائی گردانتے تھے۔ رومن سلطنت میں بنیادی نظریہ قوت کی تسخیر اور دیگر قوموں کو مادرِ وطن کے فائدہ کے لیے استعمال کرنا تھا اور خصوصی طبقہ کے معیار حیات کو بہتر بنانے کے لیے کوئی ظلم رومنوں کے لیے ناجائز نہ تھا اور مشہور زمانہ رومن انصاف ہر رومن کے لیے نہ تھا۔ اس قسم کا رویہ صرف مادی تصور حیات کی وجہ سے ممکن ہوسکتا تھا۔ ایسی مادیت جسے عقلی ذوق نے سنوارا مگر جو تمام روحانی اقدار کے لیے اجنبی تھی۔ درحقیقت رومن تہذیب کبھی بھی خدا کے تصور سے آشنا نہ تھی۔ ان کے ہاں روایتی یونانی دیومالاؤں کی دھندلی شبیہ تھی۔ وہ دھندلے دھندلے ہیولے جنہیں خاموشی سے سماجی رسوم ورواج کے فائدے کے لیے قبول کر لیا گیا تھا۔ ان خداؤں کو زندگی میں دخل اندازی کی اجازت نہ تھی۔ وہ پادریوں سے دینی رہنمائی حاصل کرتے تھے مگر یہ کبھی نہیں سمجھا گیا کہ وہ انسانوں پر اخلاقی قوانین بھی لاگو کریں گے یا ان کی سمت درست کریں گے۔

یہ وہ زمین تھی جس میں سے جدید مغربی تہذیب نمودار ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اپنے ارتقائی سفر میں اس تہذیب نے کئی اور اثرات قبول کیے۔ اس نے کئی طرح کی تبدیلیاں قبول کیں اور اپنے آپ کو کئی انداز سے بہتر بنایا۔ مگر یہ حقیقت پھر بھی عیاں ہے کہ آج مغربی اخلاقیات اور نظریہ میں جو حقیقت ہے اور زندگی کے بارے میں جو نقطۂ نظر ہے وہ قدیم رومن تہذیب ہی سے اخذ کردہ ہے۔ روم کا عقلی اور سماجی ماحول جس طرح غیر مذہبی تھا بالکل اسی طرح آج کا یورپ غیر مذہبی ہے۔ دونوں تہذیبوں میں اس جذبے کا اظہار برملا ہے۔

الہامی دین کے خلاف کسی ثبوت کے بغیر اور ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت محسوس کیے بغیر مغربی تصور حیات میں سماجی رسم کے طور پر مذہب کی ضرورت اور بعض مرتبہ شدت گوارا کرنے کے باوجود دینی اخلاقیات کو عملی دنیا سے قطعاً خارج سمجھا جاتا ہے۔ یہ تہذیب خدا کے وجود سے

انکار نہیں کرتی مگر اپنے عقلی نظام میں اس کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں پاتی۔ زندگی کو مجموعی معانی دینے میں عقل کو جو مشکلات پیش آتی ہیں مغربی تہذیب نے ان سے فائدہ اٹھایا۔ اب مغربی شہری انہی نظریات کو اہمیت دیتا ہے جو تجرباتی سائنس کی دسترس میں ہیں اور جو سماجی تعلقات پر محسوس طریقے سے اثر انداز ہوں۔ چونکہ خدا کا تصور ان دونوں میں کسی سے بھی ظاہراً متعلق نہیں اس لیے خدا کو عملی معاملات سے باہر رکھنے پر ذہنی اتفاق ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ رویہ عیسائیت سے کس طرح جوڑ کھاتا ہے۔ کیا عیسائیت جسے مغربی تہذیب کا سرچشمہ کہا جاتا ہے ایک ایسا عقیدہ نہیں ہے جو دینی اخلاقیات پر مبنی ہے؟ یقیناً ایسا ہے مگر مغربی تہذیب کو عیسائیت کا نتیجہ کہنا بڑی غلطی ہوگی، اس کی عقلی بنیادیں قدیم یورپ کے تصور حیات میں پائی جاتی ہیں جہاں دینی نقطۂ نظر کے بغیر صرف اِفادی سوچ پر زندگی کو پرکھا جاتا ہے۔ اس کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

''چونکہ ہم انسانی زندگی کی ابتداء اور اس کے انجام بعد الموت کے بارے میں یقین کے ساتھ (یعنی سائنسی تجربات سے ثابت شدہ طریقے اور حساب کتاب سے) کچھ نہیں جانتے اس لیے بہتر ہے کہ اپنی تمام قوتوں کو دینی اخلاقیات پر مبنی تصورات پر صرف کیے بغیر، (خصوصاً ایسے وقت میں جب یہ تصورات سائنس سے نبرد آزما ہیں) اپنے مادی اور عقلی امکانات پر لگا دیا جائے''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی ثقافت کا یہ نمائندہ تصور عیسائیت کے لیے اتنا ہی ناقابل قبول ہے جتنا کہ اسلام کے لیے کیونکہ اس کا خمیر بے دینی سے اٹھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی عملی کامیابیوں کو عیسائیت کی تعلیم کی کامیابی قرار دینا مضحکہ خیز ہے۔ عیسائیت نے آج کے یورپ کے بے مثال طاقتور سائنسی اور مادی ارتقاء میں بہت کم کردار ادا کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کامیابیاں عیسائی چرچ کے خلاف عرصہ دراز سے لڑی گئی علمی لڑائی کے نتیجہ میں حاصل ہوئیں۔

کئی صدیوں سے یورپی روح ایک ایسے مذہبی نظام کے شکنجے میں پھنسی ہوئی تھی جو فطرت سے نفرت پر مبنی تھا۔ انجیل مقدس ایک سرے سے دوسرے سرے تک ترک لذت کی تعلیم سے معمور ہے۔ وہ گناہ اول جو پہلے پہل کیا گیا اس کی سزا نسلِ انسانی کو خاموشی سے بھگتنی ہے، جنسی تعلقات سے انکار اس لیے کہ یہ وہی عمل ہے جس کی بناء پر آدم اور حوا جنت سے نکالے گئے۔ اس گناہ کے کفارہ میں عیسیٰ مسیح کا صلیب پر قربان ہو کر کفارہ ادا کرنا۔ یہ تمام تصورات عام زندگی کی ایسی تعبیر کرتے ہیں جن سے وہ ایک مثبت حقیقت کے بجائے ناگزیر برائی بن جاتی ہے جو روحانی ارتقاء کی راہ میں ایک رکاوٹ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ سوچ دنیاوی علوم کے لیے جو زندگی کی بہتری کے لیے ہوں، کسی طور سے سخت جدوجہد کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔ اس کے باوجود ایک طویل عرصے تک عقلِ یورپ اسی منحوس سوچ کو اپنائے رہی۔ قرون وسطیٰ میں جب یورپ پر کلیسا کا مکمل قبضہ تھا، یورپ میں نہ سائنسی تحقیق تھی اور نہ ہی اس کا کوئی جذبہ۔ یہاں تک کہ روم و یونان کے فلسفہ کے ساتھ بھی ان کا تعلق ختم ہو چکا تھا۔ اسی فلسفہ سے یورپی تہذیب کی ابتداء ہوئی تھی۔ کئی بار عقل نے سر اٹھانے کی کوشش کی مگر اس کا سر ہر بار سختی سے کچل دیا گیا۔ قرون وسطیٰ کی تاریخ اس قسم کی تلخ یادوں سے بھری ہوئی ہے جو عقل یورپ اور روح کلیسا کے درمیان واقع ہوئیں۔ کلیسا کے طوق سے یورپی دماغ کو آزادی اس نشاۃ ثانیہ کے دوران ملی جو بڑی حد تک ان ثقافتی لہروں کی مرہون منت ہے جو عرب صدیوں تک مغرب کی طرف بھیجتے رہے۔

قدیم یونانی علوم و تہذیب میں جو کچھ بہترین تھا عربوں نے زندہ کیا اور اسے اسلامی سلطنت کے قیام کے لیے بہتر بنایا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یونانی علوم کی سرایت عربوں یا مسلمانوں کے لیے تسلیم شدہ اچھائی تھی مگر ان تمام دقتوں کو تسلیم کرتے ہوئے جو اس دوبارہ احیاء شدہ یونانی ثقافت نے مسلمانوں کی راہ میں پیدا کی ہوں گی، ارسطوئی اور افلاطونی فلسفے کے اسلامی رنگ اور علم قانون نے عربوں کے ذریعے یورپ پہنچ کر وہاں ایک زبردست محرک کا کام کیا۔ قرون وسطیٰ نے یورپ کی تخلیقی قوتوں کو تہس نہس کر دیا تھا۔ سائنس کا پُرسانِ حال کوئی نہ تھا، توہم پرستی کا غلبہ تھا۔

سماجی زندگی انتہائی پست اور آج کے مقابلے میں ناقابلِ تصور تھی۔ یورپ کے بند دروازوں پر کئی طرف سے دستکیں شروع ہوئیں۔ مشرق میں صلیبی جنگوں، مغرب میں اسپین کی مسلم یونیورسٹیوں اور بعد میں بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات جو وینس اور جنیوا سے استوار ہوئے، ان سب نے یورپی عالموں اور مفکروں کی نگاہیں ایک ایسی تہذیب کی روشنی سے خیرہ کردیں جو ترقی یافتہ زندگی سے بھرپور اور ثقافتی خزانوں سے معمور تھی۔ وہ زندگی جسے یورپ کب کا فراموش کر چکا تھا عربوں نے جو کچھ کیا وہ یونانی زندگی کے احیاء سے بہت زیادہ تھا۔ انہوں نے ایک مکمل دنیا تخلیق کی تھی جو کسی نے نہ دیکھی تھی نہ سنی اور فلسفے و تحقیق کی انجانی گتھیوں کو سلجھایا۔ یہ تمام علوم مختلف راستوں سے یورپ پہنچ رہے تھے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جدید سائنسی دنیا جس میں آج ہم رہ رہے ہیں مسیحی یورپ میں نہیں بلکہ اسلامی مراکز جیسے کہ دمشق، بغداد، قاہرہ، غرناطہ، نیشاپور اور ثمرقند میں پیدا ہوئی۔

ان ترغیبات کا یورپی زندگی پر بے پناہ اثر ہوا۔ اسلامی تہذیب کے پہنچنے سے مغرب کے آسمان پر صبحِ علم طلوع ہوئی۔ اس میں نئی زندگی اور ترقی کی تڑپ پیدا ہوئی۔ یورپی مورخ اس دور کو نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں یعنی دوبارہ پیدائش۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ یورپ کی دوبارہ پیدائش تھی۔

اسلامی ثقافت نے یورپ کے بہترین دماغ کو وہ قوت فراہم کی جس سے وہ کلیسا کے زبردست اثر کا مقابلہ کر سکے۔ ابتداء میں یہ مقابلہ خارجی طور سے اسلامی تحریکوں کی شکل میں نظر آیا جو یورپ کے کئی ملکوں میں بیک وقت منظرِ عام پر آیا جس کا مقصد عیسائیت کے طرزِ فکر کو زندگی کی نئی ضروریات کے مطابق ڈھالنا تھا۔ اگر یہ تحریکیں کامیاب ہوجاتیں تو سائنس اور مذہب میں ممکنہ اتفاقِ رائے ہوجاتا مگر قرونِ وسطیٰ میں عیسائی اثرات اتنے طاقتور تھے کہ انہیں تحریکوں سے زائل نہیں کیا جاسکتا تھا لہٰذا یہ تحریکیں مختلف گروہوں کے درمیان سیاسی کشمکش میں تبدیل ہوگئیں۔ عیسائیت اپنی اصلاح کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے دفاعی صورت اختیار کرتی گئی

اور معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرلیا۔

کلیسا چاہے کیتھولک تھا یا پروٹسٹنٹ، اپنی چالوں سے باز نہ آیا۔ وہ کسی طرح اپنے ناقابل فہم تصورات کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہ تھا بلکہ انسانیت کو محرومیت سے دوچار کرنے کے باوجود اس نے اپنی ناکامیوں پر چمکیلی ملمع کاری کرنے کی کوشش کی۔ یہ ملمع کاری کھوکھلے دعووں کی تھی اس لیے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مذہب کا زور کم سے کم تر ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں فرانسیسی انقلاب اور اس کے ثقافتی اثرات کے نتیجہ میں کلیسا کا اقتدار ختم ہوگیا۔

دوسری جانب ایسا نظر آتا تھا جیسے ایک روحانی تہذیب قرون وسطیٰ کے سیکولر نظریات کی ظلمات سے نجات پاکر آزاد یورپ میں پھلنے پھولنے لگی ہے۔ دراصل اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتداء میں ہم یورپ کی عظیم اور طاقتور روحانی شخصیات کو فلسفہ، ادب، فنون اور سائنس کے میدان میں مصروفِ عمل پاتے ہیں۔ البتہ روحانی اور دینی تصور حیات صرف کچھ افراد تک محدود رہا۔ طویل عرصے تک مذہبی قوانین اور تصورات میں جکڑے رہنے کے سبب یورپی اقوام کا زندگی کی عملی جدوجہد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان زنجیروں کے ٹوٹنے پر وہ نہ تو مذہبی دنیا کی طرف دوبارہ لوٹنا چاہتے تھے اور نہ ہی لوٹ سکتے تھے۔

سب سے بڑا عقلی عنصر جس نے یورپ کے مذہبی احیاء کو ممکنہ طور سے روکا وہ عیسیٰ علیہ السلام کا خدا کا بیٹا ہونا ہے۔ فلسفیانہ ذہن رکھنے والے عیسائیوں نے کبھی بھی تولید کے اس نظریہ کو لفظ بہ لفظ تسلیم نہیں کیا۔ وہ اسے اللہ تعالی کے رحم کا انسانی اظہار سمجھتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ہر شخص فلسفیانہ ذہن نہیں رکھتا۔ عیسائیوں کی اکثریت لفظ بیٹا کے ظاہری معنی اخذ کرتی ہے۔ اگرچہ اس لفظ کے ساتھ صوفیانہ آمیزش ہمیشہ رہی ہے۔ بہر حال عام آدمی کے لیے اس کا مطلب فطری طور پر خدا کا انسانی شکل میں آنا ہے۔ یہ تصور ایک سفید داڑھی والے رحم دل بوڑھے کی شکل میں یورپ کے لاشعور کو متاثر کرتا رہا ہے۔ یورپ میں کلیسا کا دور دورہ تھا۔ اس وقت لوگ اس عجیب و

غریب تصور پر اعتراض کرنے کی ہمت نہ کرتے تھے۔ مگر جب عقل نے مذہبی زنجیروں کو توڑ دیا تو یہی یورپین، آدم کی شکل کے خدائی باپ سے مفاہمت نہ کر سکے۔ دوسری طرف خدا کا اس شکل میں آنا لازم تھا۔ علم و بصیرت کے دور کے بعد یورپی مفکرین اس تصور خدا سے خود بخود پیچھے ہٹتے گئے اور چونکہ وہ صرف اسی تصور میں خدا کو دیکھنے کے عادی تھے اس لیے انہوں نے خدا اور مذہب دونوں کو مسترد کر دیا۔

اس کے ساتھ صنعتی دور کی ابتداء نے بے انتہا مادی ترقی کی چمک دمک انسانی جھولی میں ڈال کر اسے نئی دلچسپیوں سے آگاہ کیا اور اس طرح کسی حد تک مذہب کے خلاء کو پُر کر دیا۔ اس خلا میں مغربی تہذیب کے ارتقاء نے کم از کم اس شخص کے نقطہ نظر سے جو مذہب کو انسانی نقطہ نظر سے ایک زبردست حقیقت سمجھتا ہے ایک خطرناک موڑ لیا۔ عیسائیت کی غلامی سے نکلنے کے بعد یورپی ذہن نے ہر قسم کے روحانی تصور کے خلاف اپنے آپ کو قلعہ بند کر لیا۔ اس کے تحت الشعور میں ایک خوف کارفرما تھا کہ کہیں ایک بار پھر روحانی قوتیں انہیں پابند سلاسل نہ کر لیں۔ اس طرح یورپ ہر اس نظریہ کا چیمپئن بن گیا جو فکر و عمل میں مذہب کے خلاف تھا اور اس نے ایک دفعہ رومن تہذیب کی طرف مراجعت کی۔

اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مغرب کی زبردست مادی ترقی کا سبب عیسائیت میں موجود کوئی پوشیدہ برتری نہیں تھی کیونکہ یہ مادی ترقی دراصل کلیسا کے خلاف مغرب کی زبردست جدوجہد کے بغیر ناممکن ہے بلکہ آج کا مغربی مادی تصور حیات یورپ کے اس روحانی تصور حیات کے خلاف انتقام ہے جو زندگی کے فطری حقائق سے دور چلا گیا تھا۔

اس کتاب کا مقصد عیسائیت اور جدید مغربی تہذیب کے نجی تعلقات کی گہرائی میں جانا نہیں ہے۔ میں نے تین بنیادی وجوہات بیان کرنے کی کوشش کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تہذیب اپنے طور طریقوں میں اس قدر خلاف مذہب کیوں ہے جن میں سے ایک رومی تہذیب ہے کہ جس نے مغربی تہذیب کا رویہ انسانی اور بنیادی اقدار کے حوالے سے انتہائی مادّہ پرستی پر مبنی

بنادیا۔

دوسری وجہ انسانی فطرت کا وہ ردِ عمل تھا جو مسیحیت کے نظریات یعنی ترکِ دنیا اور جائز انسانی خواہشات اور کوششوں سے بھی انکار کے خلاف رونما ہوا۔ پھر اس پر مستزاد مسیحی علماء کا متضاد رویہ جو سیاسی و معاشی لحاظ سے جابرانہ قوتوں کے روایتی حلیف بن کر ہر قسم کے استحصالی ہتھکنڈوں کو بہت بے رحمی سے جائز قرار دےدیتے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر آخری وجہ خدا کو بشری پیکر دینے کا عقیدہ تھا۔

مذہب کے خلاف یہ ردِ عمل حد درجہ کامیاب رہا۔ اس قدر کامیاب کہ کلیسا کے مختلف فرقے اپنے آپ کو یورپ کے اس نئے سماجی اور عقلی دھارے کے مطابق ڈھالنے پر مجبور ہو گئے چہ جائیکہ اپنے پیروؤں پر اثر انداز ہو کر ان کی سماجی زندگی کی تشکیل کی جاتی جو کہ ہر مذہب کا بنیادی فریضہ ہے۔ عیسائیت نے اپنے کردار کو محض قابلِ روایت بننے اور سیاسی مہم جوئی تک محدود کر لیا۔ اب عوام کے لیے اس کی اہمیت ایک روایتی پارسا کی حد تک رہ گئی تھی جیسا کہ رومی دیوتاؤں کی تھی جن کا حقیقی اور عملی زندگی میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔

بے شک آج بھی یورپ میں کچھ لوگ ہیں جو مذہبی سوچ سوچتے اور محسوس کرتے اور اپنی زندگیوں کو مذہب سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کرتے ہیں مگر یہ محض استثناء ہی ہے۔ ایک عام مغربی چاہے جمہوری ہو یا فاشسٹ، سرمایہ دار ہو یا بالشویک، عام مزدور ہو یا دانشور، ایک ہی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ ہے مادی ترقی کی پوجا۔ یہ عقیدہ کہ زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں سوائے اس کے کہ اس کو مزید آسان بنایا جائے یا جیسا کہ عام طور سے کہا جاتا ہے "فطرت سے آزادی"۔ اس مذہب کے منادر دیوہیکل فیکٹریاں، سینما گھر، کیمیائی تجربہ گاہیں، رقص گاہیں اور پن بجلی کے بڑے بڑے منصوبے ہیں۔ اس کے مبلغ بینکرز، انجینئرز، فلمی ستارے، صنعت کار اور ماہر ہوا باز ہیں۔ قوت اور لذت کے اس دور کا لامحالہ نتیجہ ایسے گروہوں کا وجود میں آنا ہے جو ایک دوسرے کے صریح دشمن ہیں اور جب بھی اور جہاں کہیں کوئی موقعہ ہاتھ آ جائے ایک دوسرے کو تباہ کرنے کا

کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔ نتیجتاً ثقافتی سطح پر ایک ایسے فرد کا وجود سامنے آتا ہے جو صرف اور صرف عملی افادیت پر یقین رکھتا ہے اور جس کے نزدیک اچھائی اور برائی میں صرف ایک ہی تمیز رہ جاتی ہے اور وہ ہے مادی کامیابی۔

مغرب آج کل جس ہمہ گیر تبدیلی ماہیئتِ قلب سے گزر رہا ہے اس میں مادی اخلاقیات سب سے زیادہ اہمیت کی حامل بنتی جارہی ہیں۔ ہر وہ خوبی جو معاشرہ کی بلاواسطہ مادی فلاح کا ذریعہ ہے خوبی کہلائے گی مثلاً تکنیکی مہارت، حُب الوطنی، قومیتی وگروہی شعور جیسی اقدار کی مبالغہ آمیز پذیرائی جبکہ وہ خوبیاں جو ابھی ماضی قریب ہی میں محض اخلاقی اقدار کی خوبیاں تھیں جیسے ماں باپ سے محبت یا جنسی وفاداری اپنی اہمیت کھورہی ہیں کیونکہ وہ معاشرہ کے محسوس مادی فوائد میں بظاہر کوئی حصہ نہیں ڈالتیں۔ مضبوط خاندانی رشتے جو گروہ یا قبیلہ کی بھلائی کے لیے فیصلہ کُن ہوتے تھے اب بڑے اجتماعی نظام سے فرسودہ قرار دے کر نکالے جارہے ہیں۔ ایک ایسے معاشرہ کے لیے جو خالص تکنیکی خطوط پر استوار ہے اور جو مزید انہی خطوط پر منظم ہورہا ہے، کے لیے بیٹے کا رویہ باپ کے لیے کسی خاص سماجی اہمیت کا حامل نہیں جب تک وہ ان حدود کی حفاظت کرے جو سوسائٹی نے اپنے افراد پر عائد کی ہیں۔ نتیجتاً مغربی باپ روز بروز اپنے بیٹے پر گرفت کھوتا جارہا ہے اور منطقی طور پر بیٹا باپ کے لیے احترام۔ ان کے آپس کے تعلقات میکانکی معاشرہ کی ترجیحات کی نذر ہورہے ہیں جو کسی طرح سے ایک فرد کی دوسرے فرد پر فوقیت کو ختم کرنے پر تُلا ہوا ہے جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خاندانی ترجیحات بھی ملیامیٹ ہوتی جارہی ہیں۔ اسی کے متوازی جدید نظریات پر استوار قدیم جنسی وفاداری کا خاتمہ ہے۔ جنسی وفاداری تہذیب مغرب میں قصہ پارینہ بنتی جارہی ہے کیونکہ ان تمام کا تعلق اخلاقیات سے تھا اور اخلاقیات کا معاشرہ کی مادی فلاح پر کوئی محسوس اور فوری اثر نظر نہیں آتا۔ نتیجتاً جنسی حیات میں تنظیم اپنی اہمیت کھوتی جارہی ہے اور اس کی جگہ جدید اخلاقی نظریہ لے رہا ہے جو بے لگام جسمانی آزادی کا قائل ہے۔ مستقبل کی جنسی اخلاقیات صرف پیدائش و اموات کے اندراجات اور جینیاتی تقاضوں کے

اصولوں پر استوار ہوں گی۔

یہاں سوویت یونین کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جہاں مذہب سے متصادم نظریات اپنے منطقی انجام تک پہنچائے گئے ہیں، جہاں کی ثقافتی حیات مغرب سے مختلف نہیں۔ اس کے برعکس ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے کمیونزم کا تجربہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ مذہب اور روح سے متصادم نظریات کی تکمیل کی جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یورپ اور کمیونزم کے درمیان موجودہ اختلاف محض دو متوازی تہذیبوں کے درمیان ایک واحد منزل کی جانب اختلافِ رفتار کی وجہ سے ہو۔ ان دونوں تہذیبوں کے درمیان یکسانیت وقت کے ساتھ آشکار ہوگی مگر ایک بات جس پر آج بھی یہ دونوں تہذیبیں متفق ہیں، یہ ہے کہ فرد کی روحانی انفرادیت کو اجتماعی مشینری پر قربان کر دیا جائے جسے معاشرہ کا نام دیا گیا ہے اور جس میں فرد کا مقام پہیے میں دُھرے سے زیادہ نہیں۔

اس بحث کا واحد ممکنہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس طرح کی کوئی تہذیب کسی ایسی تہذیب کے لیے زہرِ قاتل ثابت ہوگی جو خالصتاً دینی اقدار پر استوار ہو۔ ہمارا ابتدائی سوال کہ کیا اسلام کے طرزِ فکر اور طریق حیات کو مغرب کے اصولوں کے مطابق ڈھالا جاسکتا ہے نفی میں جواب پائے گا۔ اسلام میں فرد کا اخلاقی ارتقاء مقصدِ اولین ہے اس لیے مجرّد مادی فوائد اس کے تحت آئیں گے۔ جدید یورپی تہذیب میں حالات اس کے برعکس ہیں۔ مادی مفادات کی حکمرانی ہے اور اخلاقیات کو ایسے کونے میں دھکیل دیا گیا ہے جہاں وہ نظریاتی وجود کے ساتھ کبھی بھی معاشرہ میں اپنا کوئی کردار ادا نہ کرسکیں۔ اخلاقیات کا ذکر دوغلے پن کا دوسرا نام ہے یہی وجہ ہے کہ یورپی مفکرین اس بات میں حق بجانب ہیں کہ جب کبھی وہ سماجی مقاصد کا ذکر کریں تو مذہبی اخلاقیات سے بالاتر رہیں۔ تھوڑے کمتر مفکرین کے درمیان (جیسے کہ وہ جو اپنے اخلاقی رجحانات کے بارے میں فیصلہ نہیں کرپاتے ہیں) مذہبی اخلاقیات بحیثیت غیر منطقی فکری عنصر کے کسی حد تک زندہ ہیں جس طرح ریاضی دان کچھ غیر عقلی عددوں کے ساتھ گزارہ کر لیتے ہیں جو کہ خود تو غیر محسوس ہیں مگر ان کی ضرورت انسانی دماغی ہیئت کی کمزوری کی وجہ سے تصورات کے درمیان پُل کا کام

کرنے کے لیے پیش آتی ہے۔

مذہبی اخلاقیات کا ایسا فریبی تصور دینی تربیت کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔ اسی لیے جدید مغربی دنیا کی اخلاقی بنیاد اسلام کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں۔

اس سے یہ اخذ کرنا مناسب نہ ہوگا کہ اسلام یورپ سے عملی سائنس میں کچھ وصول نہ کرے مگر ان کے باہمی روابط اسی نکتہ پر شروع اور ختم ہو جانے چاہییں۔ آگے بڑھ کر مغربی تہذیب کی تہذیبی روح کی نقالی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسلام کے وجود کی عملی اقدار اور اس کی نظریاتی بنیاد پر ضربِ کاری نہ لگائی جائے۔

باب سوم

صلیبی جنگوں کے سائے

روحانی غیر ہم آہنگی کے علاوہ ایک سبب اور بھی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی نقل سے گریز کرنا چاہیے۔ مغربی تاریخ مسلم دشمنی سے بھری ہوئی ہے۔ یہ رجحان بھی یورپ کو قدیم ورثہ سے ملا ہے۔ یونانی اور رومن اپنے آپ کو مہذب سمجھتے تھے اور ہر اجنبی، خاص طور سے بحیرہ روم کے رہنے والے ''بربر'' یعنی غیر مہذب کہلاتے تھے۔ تب ہی سے اہلِ مغرب اپنی نسلی برتری باقی دنیا پر ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے تھے اور دوسروں یعنی غیر یورپی اقوام کے لیے نفرت مغربی تہذیب کا طرّہ امتیاز تھا۔ یہ توجیہہ اسلام کے بارے میں یورپ کے احساسات کو بیان کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ یہ ویسی لاتعلق سی نفرت نہیں جو وہ تمام مذاہب اور ثقافتوں کے لیے رکھتے ہیں بلکہ یہ بہت گہری اور دیوانگی کی حد تک نفرت میں بدلی ہوئی ہے۔ یہ صرف عقلی نہیں بلکہ اس میں گہرا جذباتی رنگ بھی شامل ہے۔ یورپ کے لوگ بدھ مت اور ہندو فلسفے کو بھی تسلیم نہیں کرتے مگر ان فلسفیوں کے بارے میں وہ ایک متوازن سوچ رکھتے ہیں۔ البتہ جہاں اسلام کا نام آتا ہے یہ عقلی توازن متزلزل ہو جاتا ہے اور جذباتی تعصب غالب آ جاتا ہے۔ بہت سے مستشرقین، تھوڑے سے استثناء کے علاوہ اپنی تحریروں میں اسی طرح کے غیر منطقی تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی تحقیقات اس نقطہ پر منتج ہوتی ہیں کہ اسلام سائنسی تحقیقات کا موضوع بن ہی نہیں سکتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اسلام ایک مجرم کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہے۔ بعض ماہرین سرکاری وکیل کا کردار ادا کرتے ہیں جو مجرم کو سزا دلوانے کے درپے ہیں اور کچھ ماہرین وکیل صفائی کا کردار ادا کرتے ہوئے مجرم کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں جس میں وکیل صفائی کو

یقین ہے کہ موکل مجرم ہے اور وہ بے دلی سے اس کی سزا کم کروانا چاہتے ہیں۔ ان مستشرقین کے طرزِ عمل سے ہمیں بدنام زمانہ کیتھولک عدالتیں یاد آتی ہیں جو قرونِ وسطیٰ میں مخالفین کے خلاف استعمال کی جاتی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ تاریخی حقائق کی کھلے دل سے تحقیق نہیں کرتے بلکہ متعصب سوچ پر مبنی پہلے سے طے شدہ نتائج حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں اور ان شہادتوں کا اہتمام کرتے ہیں جو مطلوبہ نتائج کے حصول میں ان کی مدد کر سکیں۔ جہاں من مانی شہادتیں موجود نہ ہوں وہاں وہ کانٹ چھانٹ کر کے موجودہ شہادتوں کو اپنے سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے نئے معانی پہنا دیتے ہیں یہ پوری عدالت بدنیتی اور غیر منطقی انداز کی ہوا کرتی ہے جس میں وہ مسلمانوں کا کوئی بیان نہیں لیتے اور نہ ہی اسے کوئی اہمیت دیتے ہیں۔

اس روشِ کار کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں اہلِ مغرب کے مشرقی ادب میں اسلام اور اسلامی اشیاء کی مسخ شدہ شکل نظر آتی ہے۔ یہ بگاڑ کسی ایک ملک تک محدود نہیں۔ یہ آپ کو انگلینڈ میں بھی ملے گا اور جرمنی میں بھی، روس میں بھی یہی حال ہے اور فرانس میں بھی، اٹلی میں بھی اور ہالینڈ میں بھی، مختصراً جہاں کہیں یورپی مستشرقین نے اپنی نظریں اسلام پر ڈالی ہیں وہ اسلام پر کینہ پرور اور منفی انداز کی تنقید سے بھری ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ یورپی ماہرین کوئی علیحدہ نسل نہیں بلکہ اپنے ماحول کی پیداوار ہیں، اس لیے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ مجموعی طور پر یورپی ذہن مسلمانوں اور ان کے دین اور ثقافت کے خلاف کسی نہ کسی سبب سے متعصب ہے۔ اس کی ایک وجہ دنیا کی دو دھڑوں یعنی ''یورپی'' اور ''بربر'' میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ اس کا دوسرا سبب بلاواسطہ اسلام سے ہے جو ہم ماضی اور خصوصاً قرون وسطیٰ کی طرف نظر ڈال کر سمجھ سکتے ہیں۔

متحدہ یورپ اور اسلام کے درمیان پہلا بڑا معرکہ یعنی صلیبی جنگ یورپی تہذیب کی ابتداء کا سبب بنا۔ اس وقت یہ تہذیب کلیسا کی گرفت میں تھی اور اس نے زوال روم کی تاریک صدیوں کے بعد اپنا راستہ دیکھنا شروع کیا تھا۔ اس کا ادب بھی بہار کی نوخیزیوں سے گزر رہا تھا۔ فنونِ لطیفہ بھی گاتھ، ھن اور آواریوں کی ہجرت کے بعد خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہے تھے۔

یورپ نے قرونِ وسطیٰ کے خام دور سے نکل کر ابھی ابھی ثقافتی شعور حاصل کیا تھا۔ جس کی وجہ سے احساس میں بیداری اور تیزی آئی تھی۔ ٹھیک اسی مشکل دور میں صلیبی جنگیں اسے عداوتی رشتوں میں اسلام کے آمنے سامنے لے آئیں۔ یقیناً مسلمانوں اور یورپیوں کے درمیان پہلے بھی جنگیں لڑی گئیں۔ سسلی اور اسپین کی فتح اور جنوبی فرانس پر مسلمانوں کا حملہ۔ مگر یہ لڑائیاں یورپ کی شعوری بیداری سے قبل لڑی گئیں۔ اس لیے یورپی نقطہ نظر سے یہ مقامی واقعات تھے اور ان کو خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ البتہ صلیبی جنگوں نے آنے والی صدیوں کے لیے اسلام کے بارے میں یورپی رویے کو واضح کیا۔ صلیبی جنگیں اس لیے فیصلہ کن تھیں کہ وہ یورپ کے بچپن میں واقع ہوئیں۔ جب ثقافتی خطوط پہلی بار پختہ ہو رہے تھے اور ڈھلنے کے عمل میں تھے۔ یہ عمل فرد اور قوم میں یکساں ہے۔ یعنی بچپن کے زوردار نقوش شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی بھر کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یہ اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ عقلی تجربات انہیں مشکل ہی سے مٹا سکتے ہیں یہی حال صلیبی جنگوں کا تھا جنہوں نے یورپ کے عوام الناس کی نفسیات پر بہت گہرے اور مستقل اثرات چھوڑے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے دور میں جس بین الاقوامی جذباتیت کا اظہار ہوا وہ یورپ نے نہ پہلے دیکھی نہ بعد میں۔ پورے برِّ اعظم میں ایک دیوانگی کی لہر تھی اور ایک عالمِ مستی تھا جس نے کچھ وقت کے لیے ہی سہی ملکی، قومی اور طبقاتی رکاوٹوں کو توڑ کر تاریخ میں پہلی بار یورپ کو ایک اکائی بنا دیا اور یہ اتحاد اسلام کے خلاف وجود میں آیا۔ ہم بلا مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید یورپ صلیبی جنگوں کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ اس سے پہلے اینگلو سیکسن تھے، جرمن تھے، فرانسیسی تھے، نارمن تھے، اطالوی اور ڈین تھے مگر صلیبی جنگوں میں مغربی تہذیب کا نیا تصور ابھرا۔ ایک مقصد واحد جو تمام قوموں کا ہدف واحد تھا۔ وہ تھا نفرتِ اسلام، جس نے اس مقصد کی نشوونما کی۔

یہ بھی تاریخ کا سب سے بڑا مذاق ہے کہ اجتماعی شعور کا سب سے پہلا عمل جسے ہم مغربی دنیا کی پہلی عقلی تشکیل بھی کہہ سکتے ہیں پوری طرح سے چرچ کے عمل دخل سے وجود میں آیا جبکہ یورپ کی باقی کامیابیاں صرف اس لیے ممکن ہوئیں کہ کلیسا کے خلاف عقلی بغاوت نے ہر اس

چیز کو مسترد کر دیا جس کا کلیسا سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق تھا۔ یہ چرچ اور اسلام دونوں کے لیے بہت بڑا المیہ تھا۔ کلیسا کے نقطہ نظر سے اس لیے کہ ایک اچھی ابتداء کے بعد اس نے یورپی دماغ سے اپنا تسلط مکمل طور پر کھو دیا۔ اسلام کے لیے المیہ یوں کہ اسلام پر صلیبی جنگوں کے اثرات مختلف شکلوں میں آنے والی کئی صدیوں تک کے لیے ثبت ہو گئے۔

وہ ناقابل بیان ظلم اور تباہیاں اور بے عزتیاں جو صلیب کے علمبرداروں نے خطۂ اسلام پر قبضہ کرنے کے بعد کیں (جو بعد میں ان سے چھن گئیں) مشرق و مغرب کے درمیان ہمیشہ کے لیے تلخی، نفرت اور دشمنی کا بیج بو گئیں ورنہ اس قسم کے وحشی احساسات کی موجودگی کا کوئی اور سبب نہیں۔ اگرچہ اسلام اور عیسائیت اپنی روحانی بنیادوں اور سماجی مقاصد میں قطعی مختلف ہیں تاہم وہ ایک دوسرے کو برداشت کر سکتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت و دوستی کے رشتوں میں رہ سکتے تھے۔ یہ محض نظریہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے باہمی برداشت واحترام کی پُرخلوص خواہش ہمیشہ موجود رہی ہے۔ جب خلیفہ ہارون الرشید نے اپنا نمائندہ شاہ شارلیمین (Charlemonaghe) کے پاس بھیجا تو مادی فائدے کی خواہش نہ تھی بلکہ فرینکس قوم کے ساتھ دوستی کا جذبہ کارفرما تھا۔ یورپ ان دنوں ثقافتی طور سے اتنا خام تھا کہ وہ اس موقع کی اہمیت کو نہ سمجھ سکا مگر اس نے بھی ناپسندیدگی کا اظہار نہ کیا۔ تاہم بعد میں اچانک صلیبی جنگیں افق پر ظاہر ہوئیں اور مشرق و مغرب کے تعلقات کو مکمل طور پر تباہ کر گئیں۔ محض اس لیے نہیں کہ یہ جنگیں تھیں کیونکہ قوموں کی زندگی میں کتنی ہی جنگیں لڑی جا چکی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ بھلا دی گئیں اور کتنی ہی عداوتیں دوستی میں بدل گئیں بلکہ اس لیے کہ صلیبی جنگوں کا دائرہ عمل ہتھیاروں کی جھنکار تک محدود نہ تھا اور اس کی اصلی شکل عقلی جنگ میں پنہاں تھی۔ اس دوران کلیسائے یورپ نے اسلامی تصویر کو قصداً جھوٹ اور غلط بیانیوں سے مسخ کیا اور تعلیماتِ اسلامی کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ اس دوران اسلام کو خام عیاشی اور ظالمانہ تشدد کا دین گردانا گیا جس میں باطنی طہارت کے بجائے رسوماتِ ظاہرہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ تصور یورپی ذہن میں داخل ہوا

اور رچ بس گیا اور اسی دوران پیغمبر اسلام ﷺ کی پاکیزہ سیرت کو مشتبہ اور داغدار بنانے کی کوششیں کی گئیں۔

نفرت کا بیج بویا جا چکا تھا۔ جلد ہی صلیبی جذبات یورپ کے دوسرے حصوں میں ظاہر ہوئے۔ اسپین کے عیسائیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ اس ملک کو جاہلوں سے آزاد کیا جائے۔ مسلم اسپین کی تباہی میں صدیاں لگیں مگر اس طوالت نے خلاف اسلام جذبات کو مزید گہرا کیا اور اسے استقلال عطا کیا جس کا نتیجہ اس ظلم و بربریت کی صورت میں سامنے آیا جو دنیا کی آنکھ نے کبھی نہ دیکھی تھی اور جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو اسپین سے مکمل طور پر نیست و نابود کر دیا گیا۔ اس فتح کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ اگرچہ اس کے بعد اس عظیم تمدن کی جگہ قرون وسطیٰ کی جہالت نے لے لی۔ ابھی اسپین کے واقعات کو مندمل ہونے میں کچھ وقت لگتا کہ ایک دوسرا اہم واقعہ پیش آیا جس نے مشرق و مغرب کے تعلقات کو مزید نقصان پہنچایا اور وہ استنبول کی فتح کا واقعہ تھا۔ یورپی نگاہ میں یہ بازنطینہ، یونان اور روم کی سلطنت کی باقیات میں سے تھی جو ایشیاء کی غیر مہذب اقوام اور یورپ کے درمیان فصیل کا کام دیتی تھی۔ اس کے زوال سے یورپ کے دروازے مسلم سیلاب کے لیے کھل گئے۔ آنے والے وقت میں یورپ اور اسلام کے درمیان یہ عناد نہ صرف ثقافتی بلکہ سیاسی ہو گیا اور اس نے مزید شدت اختیار کر لی۔

اسلام کے ساتھ تعلقات میں یورپ نے خوب فائدہ اٹھایا۔ نشاۃ ثانیہ میں جو یورپ میں احیائے علوم و فنون کا دور تھا، یورپ نے اسلامی اور خصوصاً عرب مآخذ العلوم سے خوب استفادہ کیا۔ یورپ نے اسلام سے ثقافت میں بہت کچھ لیا اور اس کے مقابلے میں بہت کم دیا مگر کبھی اس کا اعتراف نہ کیا جس سے اس کی پرانی اسلام دشمنی میں کمی تو کچھ نہ آئی بلکہ اس کے برعکس نفرت بڑھ کر پختہ ہو گئی اور طریقِ حیات کا ایک باقاعدہ حصہ بن گئی۔ یہ نفرت اپنی آب و تاب میں بڑھتی گئی اور مسلم نام کے ساتھ پیوست ہو گئی۔ ہر یورپی مرد و عورت کے دل پر مسلم نفرت نقش ہو گئی۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ کہ ہر ثقافتی تبدیلی کے ساتھ اس نفرت کو ثبات ہی ملا۔

جب اصلاحات کا دور آیا اور ہر مذہبی فرقہ دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو گیا اور مذہبی فرقوں نے یورپ کو تقسیم کر دیا تب بھی اسلام سے نفرت سب میں مشترک تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ والٹیر Voltaire جو عیسائیت اور کلیسا کا خطرناک دشمن تھا، اسلام اور نبی اکرم کا بھی ویسا ہی دشمن تھا۔ کچھ عشروں بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب یورپ کے پڑھے لکھے لوگ بیرونی ثقافتوں کا ہمدردانہ مطالعہ کرنے لگے مگر اسلام کے لیے ان کی روایتی نفرت چپکے سے غیر مدلل تعصب بن کر ان کی منطقی تحقیقات میں بھی داخل ہوئی اور وہ ثقافتی خلیج جو بد قسمتی سے یورپ اور مشرق کے درمیان حائل تھی وہیں کی وہیں رہی۔ اسلام سے یورپ کی نفرت ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ یہ سچ ہے کہ اوّلین مستشرقین دراصل عیسائی مشنری تھے جو کہ مسلم ممالک میں کام کیا کرتے تھے جن کا اصل مقصد یہ تھا کہ اسلام کی بگڑی ہوئی تصویر پیش کر کے مسلمانوں کے بارے میں جنہیں وہ جاہل کہتے تھے یورپی اقوام کے رویے پر اثر انداز ہوں۔

یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ پرانا روگ اپنے وقتوں میں قابل تصور تھا جب پورے یورپ پر عیسائی کلیسا کا مکمل اختیار تھا مگر اب کیونکر ممکن ہے جب وہ مذہبی احساسات یورپ میں یادِ ماضی بن چکے ہیں۔

ایک ماہرِ نفسیات کے لیے یہ گتھیاں کسی حیرت کا باعث نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک شخص اپنے مذہبی عقائد سے جو اسے بچپن میں منتقل کیے گئے تھے گلو خلاصی کر سکتا ہے مگر کچھ مافوق الفطرت رجحانات پھر بھی زندگی بھر اس کا پیچھا کرتے ہیں اور تمام منطقی وضاحتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہی چیز اسلام کی طرف یورپ کے رویے کو واضح کرتی ہے۔ اگرچہ وہ مذہبی سوچ جو خلاف اسلام غم و غصہ کی بنیاد تھی آج مادی سوچ کے لیے جگہ خالی کر چکی ہے مگر وہ نفرت و غصہ جو کبھی یورپ کے تحت الشعور میں موجود تھا آج بھی بدستور موجود ہے۔ افراد کے ساتھ اس کی قوت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے مگر اس کا وجود ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ صلیبی جنگوں والا جذبہ ہلکی شکل میں ہی سہی مگر یقینی طور پر آج بھی یورپی دل و دماغ میں موجود ہے اور اس تہذیب کا مسلم ثقافت کے لیے آج جو بھی

اندازِ فکر ہے وہ اسی پرانے سخت جان جذبے کا عکس ہے۔

مسلمان حلقوں میں ہم اکثر سنتے ہیں کہ یورپ میں اسلام کی نفرت جو ماضی کے شدید تصادم کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی آج کل بتدریج غائب ہو رہی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یورپ میں اسلام کی سماجی و مذہبی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے آثار نمودار ہو رہے ہیں اور بہت سے مسلمان بڑی سنجیدگی سے یہ سمجھتے ہیں کہ یورپ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوا چاہتا ہے۔ یہ غیر منطقی سوچ نہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ تمام مذاہب میں اسلام اور صرف اسلام ہی غیر متعصب استدلال کا متحمل ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف ہمیں ہمارے پیغمبر ﷺ نے بتایا ہے کہ تمام انسانیت مسلمان ہو جائے گی۔ تاہم مستقبل قریب میں اس کا ذرہ بھر بھی امکان نہیں۔ جہاں تک مغربی تہذیب کا تعلق ہے تو ممکن ہے کہ زبردست سماجی و ذہنی تباہیوں کی وجہ سے یورپ کا ثقافتی غرور ٹوٹ جائے اور ایسی تبدیلی واقع ہو جس کی بناء پر وہ زندگی کا کوئی دینی حل تلاش کرنے پر مجبور ہو جائے۔ آج کا یورپ اپنی مادی کامیابیوں سے سرشار ہے اور اسے یقین ہے کہ صرف عیش و آرام ہی مقصدِ حیات ہے۔ اسی کے لیے جدوجہد کی جانی چاہیے۔ خوش فہم مسلمانوں کی سوچ کے برعکس، جو ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش میں ہیں کہ یورپی ذہن فطرت کی قوت تسلیم کر چکا ہے اور اس کے مسلمان ہونے میں کچھ ہی دیر ہے، اس کا مادیت پرستانہ اور خلاف مذہب جذبہ اپنی قوت میں بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جدید سائنس ایک باقاعدہ تخلیقی قوت کے وجود کو تسلیم کرتی ہے اور یہ خوش فہم حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اندازِ فکر مغربی دنیا میں مذہبی شعور کی طلوعِ سحر ہے۔ مگر یہ طرزِ فکر یورپی سائنس کو نہ سمجھنے (misunderstanding) پر مبنی ہے۔ کوئی سنجیدہ سائنس دان کائنات کے آغاز کے لیے کسی ایک قوت کی امکانی موجودگی کو نہ رد کر سکتا ہے اور نہ کرتا ہے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ اس قوت کو کن خصوصیات سے آراستہ سمجھتے ہیں۔ تمام مذہبی نظام اس پر زور دیتے ہیں کہ یہ قوت مکمل شعور و بصیرت کی حامل ہے جو کائنات پر منصوبہ اور مقصد کے تحت

حکومت کرتی ہے اور خود لامحدود ہے۔ مگر جدید سائنس نہ تو اتنی دور جانے کے لیے تیار ہے اور نہ یہ رجحان رکھتی ہے (اور درحقیقت یہ سائنسی علم کے دائرہ سے خارج بھی ہے)۔ سائنسی شعور خودمختاری، تخلیق اور الوہیت کے سوال سے صرفِ نظر کر لیتا ہے۔ اس کا رویہ کچھ یوں ہے "نہ مجھے معلوم ہے اور نہ میرے پاس اس علم کے حصول کا کوئی سائنسی ذریعہ ہے، ہوسکتا ہے کہ ایسا ہو"۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں یہ فلسفہ ایسا رنگ اختیار کر جائے جہاں مادہ پرستی اور لاعلیت مل کر وہ رنگ حاصل کر لیں جس میں خالق ومخلوق میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ یہ سوچ مادہ پرستی کا انکار نہیں بلکہ اس کا اگلا عقلی درجہ ہوگا اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس قسم کا یقین اسلامی تصور خدا کی راہ میں مثبت پیش رفت ہوگی۔

درحقیقت یورپ اسلام سے جتنا پہلے دور تھا آج بھی اتنا ہی دور ہے۔ ہمارے دین کے خلاف اس کی تیزی میں کچھ کمی آئی ہے مگر یہ اس لیے نہیں ہوا کہ ان کو اسلامی تعلیمات سے کوئی وابستگی پیدا ہوگئی ہے بلکہ اس لیے کہ اسلام فی الوقت کمزور اور منتشر ہوتا چلا جا رہا ہے اور اب یورپ کو اسلام سے وہ خوف نہیں رہا جو پہلے تھا۔ اس خوف نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ ہر اس چیز کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھے جس پر اسلام کی چھاپ لگی ہو۔ یہاں تک کہ خالصتاً سماجی اور روحانی معاملات بھی۔ مگر اب جب کہ اسلام یورپ کے سیاسی مفادات کے سامنے بطور ایک اہم عنصر کے اپنی اہمیت کھو چکا ہے تو یہ فطری امر ہے کہ خوف کی کمی کی وجہ سے وہ اپنی بنیادی دشمنی کی تیزی میں بھی کچھ کمی کر لے۔ اگر اس میں کچھ کمی آئی ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مغرب اندرونی طور پر اسلام کے قریب آ گیا ہے۔ اس سے صرف یورپ کی فکر ظاہر ہوتی ہے۔

مغربی تہذیب نے کسی بھی طرح سے اپنا خاص مذہبی رویہ نہیں بدلا۔ یہ آج بھی زندگی کے لیے مذہبی نقطۂ نگاہ کا اتنا ہی مخالف ہے جتنا کہ پہلے تھا اور ایسی کوئی واضح شہادت نہیں کہ مستقبل قریب میں کوئی تبدیلی رونما ہونے والی ہے۔ اسلامی تبلیغ کی مغرب میں موجودگی اور یہ حقیقت کہ کچھ یورپی اور امریکی حضرات مشرف بہ اسلام ہو جاتے ہیں (ان میں سے اکثر اسلامی

تعلیمات سمجھے بغیر) کوئی قابلِ توجہ نکتہ نہیں ہے۔ ایک ایسے دور میں جب مادیت کا دور دورہ ہے یہ امر عین فطری ہے کہ کچھ افراد جو روحانیت کے متمنی ہوں بڑے شوق سے ایسے نظریہ میں دلچسپی لیتے ہیں جو مذہبی تصورات پر مبنی ہو۔ اس میدان میں مسلمان مبلغ اکیلے نہیں ہیں۔ مغرب میں کئی عیسائی صوفی تنظیمیں جو تجدید چاہتی ہیں برسرِ عمل ہیں۔ تھیوصوفی تحریک ایک مضبوط تحریک ہے۔ بدھ مت کے منادر اور بدھ مت قبول کرنے والے آپ کو ہر یورپی شہر میں ملیں گے۔ ان کے اور مسلمانوں کے ایک طرح کے منطقی استدلال ہیں۔ آج بدھ مت کے داعی بھی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یورپ بدھ مت کے قریب آ رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ دعویٰ مضحکہ خیز ہوگا۔ کچھ افراد کی بدھ مت یا اسلام میں تبدیلی کسی طرح یہ ثابت نہیں کرتی کہ ان میں سے ایک عقیدہ نے بھی مغربی زندگی کو قابل قدر حد تک متاثر کیا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں نظریات نے لوگوں کے ذہنوں میں معمولی سا تجسس پیدا کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ بھی اس حد تک جتنی کوئی نئی شے رومان مزاج ذہن پیدا کر سکتی ہے۔ یقیناً کچھ استثنائی حالات بھی ہیں، کچھ نو مسلم حق کے متلاشی ہوں گے مگر استثناء سے تہذیب کے رنگ کو بدلا نہیں جا سکتا۔ دوسری طرف اگر ہم اس استثناء کا مقابلہ ان غول کے غول مغربیوں سے کریں جو خالص مادی سماجی حلقوں میں داخل ہو رہے ہیں جیسے مارکسی اور فاشسٹ تو ہمیں مغربی سماجی رجحان کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ بڑھتی ہوئی سماجی و معاشی بے چینی اور عظیم جنگوں کا سلسلہ جس کی دہشت اور وحشت سے انسانیت ابھی تک ناواقف ہے اور جس کے نتیجے میں سائنسی خوف سے مادی غرور اس ہولناک حد تک ختم ہو جائے کہ یہ لوگ ایک بار پھر عاجزی و خلوص سے روحانی حقیقتیں تلاش کریں جس کے بعد مغرب میں کامیاب اسلامی تبلیغ ممکن ہو سکے گی۔ مگر ایسی تبدیلی مستقبل کے افق کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ یہ کہنا کہ اسلامی قوتیں یورپ کی روح پر قبضہ کرنے ہی والی ہیں بہت بڑی اور خطرناک خوش فہمی ہے۔ یہ بات مہدی کی آمد سے زیادہ نہیں جسے منطقی بھیس دیا گیا ہے۔ ایک ایسی قوت کا اظہار جو اچانک آ کر اسلام کے

لڑکھڑاتے ہوئے ڈھانچے کو نہ صرف سہارا دے بلکہ اسے قوت بخش کر دنیا پر غالب بھی کر دے۔ یہ اس لیے بھی خطرناک ہے کہ یہ خوش فہمی ہمیں خود فراموشی اور سہل انگاری پر آمادہ کرتی ہے اور ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم ثقافتی طور پر کہیں کے نہیں رہے ہیں۔ آج جبکہ مغربی اثرات دنیا میں بہت طاقتور ہیں ہم سو رہے ہیں اور یہ اثرات اسلامی معاشرے کو ہر ہر مقام پر تباہ کر رہے ہیں۔ اسلام کے پھیلاؤ کی خواہش رکھنا اور بات ہے اور اس خواہش پر جھوٹی امیدیں باندھنا دوسری۔ ہم اسلامی نور کے دور دراز مقامات پر پھیلاؤ کے خواب دیکھ رہے ہیں جبکہ اسلام کا نوجوان ہمارے اپنے ماحول سے اٹھ کر ہمارے مقصد اور امید سے فرار اختیار کر رہا ہے۔

باب چہارم

تعلیم کے بارے میں

مسلمانوں کا یورپی تہذیب کی طرف ایک قوت واحدہ کی حیثیت سے دیکھنا جو آخران کی ٹھہری ہوئی تہذیب کو نئی زندگی بخشے دراصل اپنا اعتماد کھونے کے مترادف ہے جو بالواسطہ اس مغربی نظریہ کی حمایت ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔

اسلام اور مغربی تہذیب مکمل طور سے مختلف تصورات پر مبنی ہیں۔ اس لیے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ ایسی صورت میں ہم کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ مسلمان نوجوان جسے ہم مغربی خطوط پر تعلیم دے رہے ہیں خلاف اسلام اثرات سے محفوظ رہ سکے گا جبکہ یہ تعلیم پوری طرح سے یورپی ثقافتی تجربات پر مبنی ہے۔ مسلمانوں کی مغربی تعلیم انہیں پیغام رسول ﷺ کی جڑ کاٹنے پر مجبور کرتی ہے اور ماسوائے غیر معمولی صورتوں کے جب ایک خاص روشن دماغ اپنے تعلیمی مواد پر غالب آجائے یہ ان کی اس قوت ارادی کو مجروح کرتی ہے جس سے وہ اس روحانی تہذیب اسلامی کے علمبردار ہونے میں فخر محسوس کریں۔ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مغربی خطوط پر تعلیم پانے والے دانشوروں میں دینی یقین تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غیر تعلیم یافتہ لوگوں میں اسلام نے اپنی عظمت برقرار رکھی ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اسلامی پکار کے جواب میں دانشوروں کے مقابلے میں ہم ان کے اندر ایک بڑا جذباتی ردعمل پاتے ہیں۔ وہ بہتر ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اس بے گانگی کا مطلب یہ نہیں کہ مغربی سائنسی علوم نے ہمارے دین کے خلاف کوئی عقلی بحث کی ہے بلکہ جدید مغربی تہذیب کا ماحول اتنا شدید خلاف مذہب ہے کہ یہ مسلم نوجوان کی پوشیدہ مذہبی قوتوں کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔

دینی یقین اور بے یقینی صرف بحث پر موقوف نہیں۔ کچھ حالات میں دونوں میں سے کوئی بھی وجدان یا بصیرت سے حاصل ہوتے ہیں مگر زیادہ تر یہ انسان کو اس کے ثقافتی ماحول سے ملتے ہیں۔ ذرا اس بچے کے بارے میں سوچیے جو بچپن سے موسیقی کی اعلیٰ درجے کی دھنوں کے بارے میں منظم طور پر تربیت یافتہ ہو۔ اس کے کان سُر تال اور ہم آہنگی سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ بچہ بعد میں اگر موسیقار نہ بھی بنا تو کم از کم مشکل موسیقی کو سمجھنے کی استعداد تو بہرحال رکھے گا۔ مگر ایک بچہ جس نے پوری زندگی کبھی موسیقی جیسی کوئی شے نہ سنی ہو تو بعد میں وہ اس قابل نہ ہوگا کہ اس کے مختلف عناصر کی اہمیت کو سمجھ سکے۔ یہی حال دینی تعلق کا ہے۔ جس طرح کچھ لوگ موسیقی کے لیے بالکل بہرے ہیں اسی طرح کچھ لوگ دین کی آواز کو سننے کے لیے بہرے ہیں۔ مگر انسانوں کی اکثریت کے لیے دین اور بے دینی کا یہ اختیار وہ ماحول ہوتا ہے جس میں وہ پلے بڑھے ہوں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

كُلُّ مَولُودٍ يُولَدَ عَلَى الفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْيُنَصِّرَانِهٖ اَوْيُمَجِّسَانِهٖ. (بخاری کتاب الجنائز)

ہر بچہ بنیادی پاکی پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس کے والدین ہیں جو اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔

لفظ والدین جو اوپر کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے منطقی طور پر عام ماحول، خاندانی زندگی، اسکول اور معاشرہ تک پھیلایا جاسکتا ہے جو بچے کی ابتدائی نشو و نما کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج کے مذہبی لحاظ سے زوال پذیر دور میں مسلمان گھرانوں کا ماحول دینی لحاظ سے اتنا کمزور اور گرا ہوا ہے کہ یہ بچوں کے لیے دین سے روگردانی کرنے کا پہلا محرک ثابت ہوسکتا ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ مسلمان نوجوان کی مغربی خطوط پر تعلیم ان میں دین کے خلاف رجحان پیدا کردے۔ مگر اصل سوال یہ ہے کہ جدید تعلیم کی جانب ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ مغربی تعلیم پر اعتراض کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام تعلیم ہی کے خلاف ہے۔ ہمارے

مخالفین کا الزام نہ نظریاتی اعتبار سے اور نہ ہی تاریخی بنیادوں پر درست ہے۔ قرآن پاک میں متعدد ایسی آیات موجود ہیں: ''تا کہ تم عقل پکڑو'' ''تا کہ تم سوچو'' ''تا کہ تم جانو'' اور کتاب پاک میں درج ہے ''و علم آدم الاسماء کلھا'' (البقرۃ ۲:۳۱)۔ ''اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھائے'' اور بعد کی آیات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس علم الاسماء ہی کی وجہ سے آدم کو ملائکہ پر فوقیت حاصل ہوئی۔ نام، ایک تمثیلی انداز ہے، قوتِ ادراک کے ظاہر کرنے کا، وہ قوت جو انسان کو خلیفہ اللہ فی الارض بناتی ہے۔ سوچ کے منظم استعمال کے لیے انسان کو علم سیکھنا ہے۔ اسی لیے پیغمبر ﷺ نے فرمایا **من سلك طريقا يلتمس فيه علما سهّل الله له طريقا الى الجنه** (جامع ترمذی)

> ''جو شخص علم کی راہ چلے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیں گے''۔
>
> **ان فضل العالم على العابد كفضل القمر ليلة البدر على سائر الكواكب** (مسند ابن حنبل)
>
> ''ایک عالم کی فضیلت ایک عابد پر یوں ہے جیسے چودہویں کے چاند کی دیگر تمام ستاروں پر''۔

مگر اس بات کی چنداں ضرورت نہیں کہ آیات قرآنی یا احادیث رسول ﷺ کو علم کے بارے میں اسلامی رجحان کے لیے پیش کیا جائے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ کسی دین نے سائنسی ترقی پر اتنا زور نہیں دیا جتنا کہ اسلام نے۔ دین کی بنیاد پر علوم اور سائنس کی ترقی کی اتنی حوصلہ افزائی کی گئی کہ عباسی، اموی اور عرب اسپین میں شاندار تہذیب و ثقافت اُبھری۔ یورپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ ان کی تہذیب کا صدیوں بعد احیاء، اسلام کی وجہ سے ہوا۔ میں یہ ذکر اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ آج جبکہ اسلامی دنیا نے ماضی کی اپنی شاندار روایات کو بھلا دیا ہے اور اندھیرے اور علمی غربت میں پھنسی ہوئی ہے، ہم ان یادوں پر فخر کریں۔ ہمیں اپنی آج کی پریشانی کو دیکھتے

ہوئے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم ماضی کی عظمت پر اظہار تفاخر کریں۔ مگر ہمیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ یہ اسلامی تعلیمات میں کسی قسم کی کمی نہیں بلکہ مسلمانوں کا تغافل ہے جو آج ہمیں زوال سے ہمکنار کیے ہوئے ہے۔

اسلام کبھی ارتقاء اور سائنس کی راہ میں حائل نہیں ہوا۔ وہ انسانوں کی عقلی کاوشوں کو اس مقام پر لے جاتا ہے جہاں وہ فرشتوں سے بہتر ہو جاتا ہے۔ کسی دوسرے دین نے علم و منطق کو سلطنت کے دیگر امور حیات سے اتنا آگے نہیں بڑھایا۔ اگر ہم اپنے آپ کو اس دین کی تعلیمات سے ہم آہنگ رکھیں تو ہم کبھی جدید علوم کو اپنی زندگی سے خارج نہیں کر سکتے۔ ہم میں سیکھنے، ترقی کرنے اور سائنسی و معاشی طور سے آگے بڑھنے کی اتنی ہی خواہش ہوگی جتنی کہ مغربی اقوام میں ہے۔ البتہ اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ہر چیز، ہر معاملے اور مسئلے کو مغرب کی آنکھ سے دیکھنا چھوڑ دیں، یعنی اپنی اسلامی اور روحانی تہذیب کو مغربی مادی تہذیب سے نہ بدلیں۔

علم ایک بین الاقوامی فطری حقیقت ہے۔ یہ نہ مشرقی ہے نہ مغربی۔ البتہ مختلف ثقافتی مزاجوں میں حقائق کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھا اور پیش کیا جاتا ہے۔ حیاتیات، نباتیات، حیوانیات اور ریاضی نہ مادی ہیں نہ روحانی۔ ان کا تعلق علم مشاہدہ سے ہے جن سے حقائق کو جمع کر کے ان سے قوانین اخذ کیے جاتے ہیں۔ مگر جو نتائج ہم اخذ کرتے ہیں وہ صرف حقائق اور مشاہدات پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ ان کا تعلق ہمارے اندرونی مزاج اور زندگی و مسائل کے بارے میں ہمارے رجحانات سے ہوتا ہے۔ عظیم جرمن فلسفی کانٹ (Kant) نے کہا:

> ''یہ عجیب لگتا ہے مگر ہے یقینی کہ ہماری عقل فطرت سے نتائج اخذ نہیں کرتی بلکہ تجویز کرتی ہے''۔

مختصراً یہ داخلی زاویہ نگاہ ہی ہوتا ہے جس سے فرق پڑتا ہے کیونکہ اس سے شے کے معنی میں کاملاً تبدیلی آجاتی ہے۔ اس لیے سائنس جو کہ مادی ہے نہ روحانی ہمیں کائنات کی اختلافی

تعبیر دے سکتی ہے یعنی وہ ہمیں ہمارے اپنے مزاج کے مطابق روحانی نتائج بھی دے سکتی ہے اور مادی بھی۔ مغرب اپنے منجھے ہوئے شعور کے باوجود مادیت کی طرف راغب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تصورات اور بنیادی مفروضات میں خلافِ دین ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ مجموعی طور پر مغربی تعلیم بھی ایسی ہی ہو۔ دوسرے لفظوں میں جدید تجزیاتی سائنس کا مطالعہ مسلمانوں کی ثقافتی حقیقت کے لیے خطرناک نہیں بلکہ تہذیب مغرب کی مرعوبیت اور اس کو اپنانے کا جذبہ، جن کے تحت مسلمان ان علوم کی طرف جاتے ہیں وہ خطرناک ہیں۔

یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ سائنسی تحقیق سے طویل عرصہ کی بیگانگی اور لاپرواہی نے ہمیں مغربی ذرائع کا محتاج بنا دیا ہے۔ اگر ہم نے وہ بنیادی اسلامی اصول اپنایا ہوتا جس کے مطابق ہر مسلمان پر علم کا حصول فرض ہے تو ہم جدید سائنس کے لیے آج یورپ کی طرف یوں نہ دیکھ رہے ہوتے جیسے کوئی پیاسا سراب کی طرف دیکھتا ہو۔ مگر چونکہ مسلمانوں نے طویل عرصہ تک ترقی و تحقیق کے مواقع کو ضائع کیا ہے تو آج وہ جہالت و غربت کے غار میں گھرے ہوئے ہیں جبکہ یورپ نے آگے کی سمت ایک بڑی جست لگا لی ہے۔ اس فرق کو مٹانے میں بڑا وقت لگے گا اور اس وقت تک ہمیں مجبوراً علم کو ان کے توسط ہی سے قبول کرنا پڑے گا۔ مگر ہمیں صرف سائنسی مواد پر ہی قناعت کرنی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں سائنس کو مغربی خطوط پر پڑھنے میں کوئی عار نہیں مگر ان کا فلسفہ کبھی بھی قابلِ قبول نہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فی زمانہ گمانی فلسفے اور تجرباتی سائنس میں خطِ امتیاز کھینچنا بہت مشکل ہو گیا ہے مثلاً جوہری حیاتیات، تجرباتی تحقیقات سے آگے بڑھ کر فلسفہ کی حدود میں داخل ہو گئی ہیں۔ یہ صحیح ہے مگر یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی ثقافت کو اپنا وجود ثابت کرنا ہوگا۔ یہ مسلمان سائنس دانوں کا فرض ہوگا اور ان کے لیے ایک موقع ہوگا کہ جب وہ سائنسی تحقیق کی ان حدوں پر پہنچیں تو مغربی فلسفیانہ نظریات سے آزاد ہو کر اپنی متوقع قوتوں کو استعمال کریں۔ عین ممکن ہے کہ اپنے اسلامی رجحانات کے مطابق وہ مغربی سائنس دانوں سے مختلف اور بہتر نتائج پر پہنچیں۔

مستقبل کچھ بھی دکھائے، یہ یقیناً ممکن ہے کہ سائنس کا مطالعہ اور تدریس مغرب کے عقلی رجحانات کو غلامانہ طور پر اختیار کیے بغیر کیا جائے۔ اسلامی دنیا کو آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ جدید سائنسی و تکنیکی ساز و سامان ہے نہ کہ فلسفیانہ نقطۂ نظر۔

اگر مجھے ایک ایسی مثالی تعلیمی مشاورتی کونسل کو رائے دینی ہو جسے صرف اسلامی منشاء کا پاس ہو تو میں اس نقطہ پر زور دوں گا کہ مغرب کی تمام عقلی کامیابیوں میں سے صرف (اوپر بیان کردہ محدود تقاضوں کے پیشِ نظر) سائنس اور ریاضیات کو مسلم اسکولوں میں پڑھایا جائے۔ جبکہ یورپی ادب، تاریخ اور فلسفہ کو وہ اہمیت نہ دی جائے جو آج کل دی جا رہی ہے۔ یورپی فلسفے کے بارے میں ہمارا رویہ شروع سے ہی صاف ہونا چاہیے۔ یورپی ادب کو نظر انداز تو نہ کیا جائے البتہ اس کو اپنے فلسفیانہ پس منظر میں رکھا جائے۔ جس طرز پر اسے مسلم ممالک میں پڑھایا جا رہا ہے وہ یقیناً زیادتی ہے۔ اس کی قدروں کے بارے میں انتہائی مبالغہ آرائی ہمارے نوجوانوں اور ناپختہ ذہنوں کو مغربی تہذیب کے منفی اثرات سے آگاہ کیے بغیر انہیں مائل کرتی ہے کہ وہ اس کی نہ صرف لفظی تعریف کریں بلکہ عملی تقلید بھی۔ اور یہ اسلامی روح کے ساتھ ممکن نہیں۔ مسلم مدارس میں یورپی ادب کو ایسے اسلامی شہہ پاروں سے بدل دینا چاہیے جو امتیازی خصوصیات کی حامل ہوں اور جن کا مقصد طلباء کو اسلامی ثقافت کی گہرائی اور دلکشی سے آگاہ کرنا ہو تاکہ ان میں مستقبل کے لیے نئی امیدیں پیدا ہوں۔

اگر یورپی ادب مسلم نوجوانوں کی اسلام سے بیگانگی کا ایک سبب ہے تو یہی کچھ تاریخ عالم کی یورپی تعبیر کے لیے بھی سچ ہے۔ اس میں بھی وہی پرانا رویہ یعنی رومن بمقابلہ بربر سامنے آتا ہے۔ ان کی تاریخ اس نصب العین کے تحت لکھی جاتی ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مغربی اقوام اور ان کی تہذیب دنیا کی کسی بھی تہذیب و قوم سے ممتاز ہے اور اس طرح یہ باقی دنیا پر ان کے غلبہ کے لیے اخلاقی جواز مہیا کرتی ہے۔ رومن دور سے آج تک یورپی اقوام مشرق و مغرب کے اختلافات کو مغربی تناظر میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ دنیا کی دیگر اقوام کے ارتقاء کو یورپ کے

ثقافتی تجربات کے حوالے سے دیکھتی ہیں۔ زاویہ نظر کی یہ تنگی، بگڑی ہوئی تصویر پیش کرتی ہے اور جب کبھی یورپی نقطہ نظر سے دوری واقع ہوتی ہے تو ان کے لیے حقائق کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل تک خود ستائشی کا یہ حال تھا کہ تاریخ عالم دراصل تاریخ یورپ تھی۔ غیر یورپی قوموں کا تذکرہ صرف وہیں تھا جہاں وہ یورپی اقوام کی زندگی پر اثر انداز ہوں۔ جب آپ یورپی اقوام کی تاریخ کو نہایت تفصیل سے بیان کریں اور اس میں وقتاً فوقتاً مختلف رنگوں کی آمیزش کر کے اسے رنگین بنائیں اور کبھی کبھار اس میں دیگر اقوام کا ذکر کر دیا کریں تو قاری اس پُر فریب دام میں بہ آسانی آجائے گا کہ یورپی اقوام کی کامیابیاں دوسری اقوام عالم کے مقابلے میں بے حد و حساب ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کو یورپ اور اس کی تہذیب کے لیے بنایا گیا ہے اور دوسری تہذیبوں کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ مغربی عظمت کو اس کا صحیح مقام مل سکے۔ اس تاریخی تربیت کا نتیجہ مسلم نوجوانوں کے ذہن پر اپنی ثقافت، اپنے ماضی اور اپنے مستقبل کے بارے میں احساسِ کمتری کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ ایک منظم طریقے سے ان کی تربیت ہوتی ہے کہ وہ ہر اس مستقبل سے نفرت کریں جو مغربی تصور کے زیرِ اثر نہ ہو۔

ان مضر اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ذمہ دار مسلم رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ مسلم اداروں میں تاریخِ عالم کی تدریس پر دوبارہ نظر ڈالیں۔ بے شک یہ ایک مشکل کام ہے اور اس کے لیے ہمیں اپنی تاریخی تربیت میں مکمل تبدیلی لانا ہوگی تا کہ ہم مسلم آنکھ سے نظر آنے والی جدید تاریخ عالم لکھ سکیں۔ یہ کام جتنا مشکل ہے اتنا ہی ضروری ہے اور یہ ناممکن بھی نہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہماری نئی نسل کے ذہنوں کی پرورش اسلام سے منافرت پر ہوتی رہے گی۔

ہمارا ایمان ہے اور مغرب میں پیش آنے والی حالیہ صورت حال نے یہ یقین مزید پختہ کر دیا ہے کہ اسلامی اخلاق، اس کے سماجی اور شخصی اخلاقی تصور عدل و آزادی، مغرب کے متبادل تصورات و نظریات کے مقابلے میں بے حد بلند اور کامل ہیں۔ اسلام نے نسلی منافرت کا خاتمہ کیا

ہے اور انسانی برادری اور مساوات کا راستہ کھولا ہے۔ مگر مغربی تہذیب اب تک نسلی و قومی مخالفت کے تنگ دائرے سے باہر نہیں نکل سکی۔ اسلام نے طبقات اور طبقاتی کشمکش کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ مگر پوری یورپی تاریخ روم و یونان کے زمانے سے لے کر آج تک طبقاتی جدوجہد اور سماجی نفرت سے بھری پڑی ہے۔ یہ بات بار بار دہرانے کی ہے کہ وہ واحد شے جسے مسلمان یورپ سے سیکھ سکتے ہیں وہ ہے سائنس اور اس کے خاص استعمالات۔ سائنسی علم کی تلاش میں بیرونی مدد کہیں مسلمان کو یہ سوچنے پر مجبور نہ کر دے کہ مغربی تہذیب اسلامی تہذیب سے کسی طرح افضل ہے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے معلوم ہی نہیں کہ اسلام کیا شے ہے؟ ایک تہذیب کی دوسری تہذیب پر برتری مادی علوم کے بڑے ذخیرے سے ثابت نہیں ہوتی (اگرچہ کہ موخر الذکر ایک قابل طلب شے ہے) بلکہ اس کی اخلاقی قوت اور زندگی کی ہر شکل میں تشریح کرنے کی اہلیت سے واضح ہوتی ہے۔ ہمیں اس کے اصول صرف اس حد تک اپنانے ہیں کہ ہم وہ کچھ حاصل کر سکیں جو انسان میں حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ مگر مغربی تہذیب کی نقل نہ ہم کر سکتے ہیں اور نہ ہمیں کرنی چاہیے، اگر ہم اسلامی اقدار کی حفاظت اور احیاء چاہتے ہیں وگرنہ اسلامی جسم پر اس تہذیب کے عقلی اثرات، اس سے پہنچنے والے فوائد کے مقابلے میں نقصان دہ زیادہ ہوں گے۔

اگر مسلمان ماضی میں سائنسی تحقیق سے بے خبر تھے تو اس غلطی کا ازالہ مغربی علوم کی اندھی تقلید سے نہیں ہو سکتا۔ ہمارا سائنسی تنزل اور ہماری غربت اس زہریلے اثر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو ہمیں مغربی علوم کے ڈھانچے کی اندھی تقلید سے حاصل ہوگا اور اس کے نتیجے میں جو اثرات مسلم دنیا کے دینی امکانات پر پڑیں گے۔ اگر ہم میں اسلامی حقائق کی بحیثیت ثقافتی عنصر کے حفاظت کرنے کی خواہش ہے تو ہمیں مغربی تہذیب کے دانشوروں سے اپنی حفاظت کرنا ہوگی۔ یہ تہذیب معاشرے اور ہمارے میلانات پر غلبہ پانے والی ہے۔ مغربی دنیا کے طور طریقے اپنا کر مسلمان تدریجاً مجبور کیے جا رہے ہیں کہ وہ مغربی نقطۂ نظر اپنائیں کیونکہ خارجی نقل آہستہ آہستہ انسان کو اس نظریہ کی طرف لے جاتی ہے جو اس خارجیت کا ذمہ دار ہے۔

باب پنجم

تقلیدِ مغرب

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی طرزِ زندگی کی انفرادی و اجتماعی تقلید اسلامی تہذیب کے احیاء بلکہ وجود کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس ثقافتی روگ (اسے اور کیا کہا جا سکتا ہے) جس کی ابتداء کئی عشرے پہلے ہوئی جب مسلمانوں نے مایوس ہو کر مغرب کی مادی قوت و ارتقاء کا مقابلہ اپنی افسوسناک حالت سے کیا۔ مسلمانوں کی اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت (جس کا سب سے بڑا سبب نام نہاد تنگ نظر علماء تھے) سے ایک نظریہ نے جنم لیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ مسلمانوں کو ترقی کرنے کے لیے مغرب کے معاشی اور سماجی انداز کو اپنانا ضروری ہے۔ مسلم دنیا جمود کا شکار تھی اور کئی مسلمان اس سطحی نتیجہ پر پہنچے کہ اسلامی نظام معاشرہ و معاشیات ارتقاء کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا۔ ان دانشوروں نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ اسلامی تعلیمات کہاں تک مسلمانوں کے زوال کی ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ ان کے وقت کے علماء کی تعلیمات مادی کامیابیوں اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ انہوں نے شریعت کو موجودہ زمانے کا فقہ ہی سمجھا جو جمود کا شکار ہو چکا تھا اور موخرالذکر کو کئی لحاظ سے کمزور پایا۔ نتیجتاً شریعت سے ان کی دلچسپی بالکل ختم ہو گئی اور اسے تاریخ اور علم الکتب کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس طرح تقلید مغرب ہی ان کے سامنے انتشار کی دلدل سے نکلنے کا واحد راستہ رہ گئی۔

حالیہ دور کے چند فاضل مفکرین نے جن میں سید حلیم پاشا بھی شامل ہیں، حتمی طور سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی شریعت جدید ترقی کی راہ میں حائل نہیں۔ ان مفکرین کے اچھے اثرات کو دوسرے درجہ کے معذرت خواہانہ ادب کے ذریعے سے بے اثر کر دیا گیا۔ اسلامی تعلیمات کو ترک

کرتے ہوئے نہیں بلکہ یہ کہہ کر کہ اسلامی شریعت میں مغربی تہذیب کی تقلید کو جائز بنایا گیا ہے، اس طرح اسلامی ارتقاء کے بھیس میں اس کے بنیادی سماجی اصولوں کو ترک کرنے کے لیے تدریجاً راستہ ہموار کردیا گیا۔ یہ نظریہ آج کے کئی مسلم ترقی یافتہ ملکوں کے ارتقاء کے پیچھے کارفرما ہے۔

بہت سے مسلم دانشور کہتے ہیں کہ اس سے کوئی روحانی فرق نہیں پڑتا کہ ہم اس طرح زندگی گزاریں یا اس طرح۔ کہ ہم یورپیوں کا لباس پہنیں یا اپنے والدین کا۔ آیا ہم اپنے رسم و رواج میں قدامت پسند ہیں یا نہیں۔ یقیناً اسلام میں کوئی تنگ نظری نہیں ہے جیسا کہ پہلے باب میں کہا گیا ہے۔ اسلام انسان کو دینی احکام کے دائرہ میں رہتے ہوئے اختیاری امکانات فراہم کرتا ہے۔ مگر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ کئی ایک طور طریقے جو کہ یورپ کے سماجی ڈھانچے کا بنیادی حصہ ہیں اسلامی تعلیمات سے ٹکراتے ہیں۔ مثلاً مختلف جنسوں کا باہمی اختلاط۔ یا اصل زر یا جنس پر سود۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مغربی تہذیب کا اندرونی کردار قطعی طور سے دین کو اپنے دائرہ فکر سے خارج کرنے کے بعد وجود میں آیا ہے اور صرف سطحی نظر رکھنے والے لوگ ہی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کسی تہذیب کی ظاہری تقلید اس کی روح سے متاثر ہوئے بغیر ممکن ہے۔ کوئی تہذیب محض شکل ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک زندہ قوت ہوا کرتی ہے۔ جس لمحہ ہم شکل کو اپناتے ہیں اس کے اندر موجود قوتیں اور اثرات ہم پر کام کرنا شروع کردیتے ہیں اور ہمیں دھیرے دھیرے غیر محسوس طور پر اپنے ذہنی سانچے میں ڈھالنا شروع کردیتے ہیں۔ یہ تجربہ حضور اکرم ﷺ کے اس قول کی صداقت کی گواہی دیتا ہے کہ:

من تشبّہ بقوم فھو منھم

''جو کسی قوم جیسا بنتا ہے تو انہی میں سے ہو جاتا ہے''۔ (مسند ابن حنبل، سنن ابی داؤد)

یہ معروف حدیث نہ صرف ایک اخلاقی اشارہ ہے بلکہ مسلمانوں کے ایک معروضی نصیحت بھی ہے کہ اگر مسلمان غیر مسلموں کی تہذیب اپنائیں گے تو آپ ہی ان میں ضم ہوتے چلے جائیں گے۔

اس لحاظ سے اہم اور غیر اہم سماجی پہلوؤں میں فرق کرنا تقریباً ناممکن ہے۔اس سیاق و سباق میں کچھ بھی غیر اہم نہیں۔ مثلاً اس سے بڑی کوئی غلطی نہیں ہوسکتی کہ ہم فرض کرلیں کہ لباس محض ایک خارجی شے ہے اوراس کا انسانی شخصیت کے عقلی اور روحانی پہلوؤں سے کوئی تعلق نہیں۔لباس عام طور سے قوموں کے طویل العمر ارتقاء کا نتیجہ ہوتا ہے۔لباس کا انتخاب لوگوں کے جمالیاتی تصورات اور رجحانات کا عکاس ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کے کرداراور میلانات کے مطابق بار بار بدلا جاتا ہے۔یورپی فیشن آج کے دور کے یورپی کردار کی مکمل غمازی کرتا ہے۔مغربی لباس پہن کر مسلمان لاشعوری طور پر اپنے مزاج کو مغربی ذوق سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس طرح ڈھال لیتا ہے کہ وہ مغربی لباس سے مناسبت پیدا کرلے اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے ثقافتی امکانات ترک کردیتا ہے۔وہ اپنا جمالیاتی اثاثہ اپنا جمالیاتی ذوق، اپنی پسند اور ناپسند کو یورپ کی عقلی اوراخلاقی غلامی کے چارے پر قربان کردیتا ہے۔

جب کوئی مسلمان مغربی لباس اوراس کے طورطریقوں کی تقلید کرتا ہے تو وہ یورپی تہذیب کے لیے اپنی اندرونی ترجیحات ظاہر کرتا ہے چاہے اس کے دعوے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ عملاً ناممکن ہے کہ کسی تہذیب کی روح کو تسلیم کیے بغیر اس کے جمالیاتی ذوق وفکر کی نقل کی جائے۔یہ اتنا ہی ناممکن ہے کہ مسلمان رہتے ہوئے اس تہذیب کے جذبے کی قدردانی کی جائے جو دینی نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔

بیرونی تہذیب کی تقلید کا رجحان احساس کمتری کے نتیجے میں وجود میں آیا۔وہ مسلمان جو آج مغربی تہذیب کی تقلید کا شکار ہیں وہ صرف اور صرف اسی سبب سے ایسا کرتے ہیں۔وہ مغربی قوت، اس کے تکنیکی فن اور چمکتی سطح کا مقابلہ مسلمانوں کی زوال پذیری سے کرتے ہیں۔وہ یقین کرلیتے ہیں کہ ہمارے وقت میں صرف مغربی طریقہ ہی واحد راستہ ہے۔ اسلام کو اپنی کوتاہیوں کا ذمہ دار ٹھہرانا ایک فیشن بن چکا ہے۔زیادہ سے زیادہ ہمارے نام نہاد دانشور خود کو قائل کرنے لگتے ہیں اورایک معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرلیتے ہیں کہ اسلام مغربی تہذیب کے ساتھ

چل سکتا ہے۔

اسلام کے احیاء کے لیے کسی اصلاحی قدم اٹھانے سے پہلے مسلمانوں کو معذرت کے احساس سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ مسلمانوں کو سر اٹھا کر جینا چاہیے۔ ان میں احساس ہونا چاہیے کہ وہ دنیا میں مختلف اور سب سے ممتاز ہیں اور اس امتیاز پر انہیں فخر ہے۔ ہر مسلمان کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس فرق کو ملحوظ رکھے اور دنیا پر یہ فرق بغیر کسی معذرت اور بغیر کسی ملاوٹ کے بہادری سے ظاہر کرے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو بیرونی آوازوں سے الگ تھلگ کر لے۔ کسی بھی تہذیب کے مثبت اثرات کو اپنی روایات تباہ کیے بغیر قبول کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یورپ نے کتنی تیزی سے عرب اثرات کو تکنیک اور علم میں قبول کیا۔ مگر انہوں نے ظاہری اثرات اور عرب ثقافت کو کبھی قبول نہ کیا اور اپنی جمالیاتی و عقلی آزادی کو کبھی قربان نہ کیا۔ انہوں نے عرب اثرات کو اپنی زمین میں صرف کھاد کی طرح استعمال کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے عربوں نے قدیم یونانیوں سے اثر لیا تھا۔ دونوں صورتوں میں نتیجتاً ایک طاقتور دیسی تہذیب ابھری جسے اپنے آپ پر اعتماد اور فخر تھا۔ کوئی تہذیب اس افتخار اور ماضی سے رشتہ جوڑے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

مگر عالمِ اسلام اپنی یورپی تقلید کے رجحانات اور مغربی تصورات و نظریات جذب کرتے ہوئے بتدریج ان کڑیوں کو توڑ رہا ہے جو اسے اپنے ماضی سے جوڑے ہوئے ہیں (گویا عالم اسلام مغربی اثرات جذب نہیں کر رہا بلکہ خود ان میں تحلیل ہو رہا ہے) اور اس طرح نہ صرف اپنی ثقافت بلکہ اپنا روحانی جذبہ بھی کھو رہا ہے۔ اس کی مثال ایک درخت کی سی ہے جو اس وقت تک تناور تھا جب تک اس کی جڑیں زمین میں گہری جمی ہوئی تھیں مگر مغربی پہاڑی نالوں نے اس کی جڑوں سے مٹی ہٹا دی ہے اور درخت غذا کی کمی کی وجہ سے دھیرے دھیرے سوکھنے لگا ہے۔ اس کے پتے گرنے لگے ہیں اور شاخیں سوکھنے لگی ہیں آخر کار درخت کا تنا بھی گرنے ہی والا ہے۔

اس لیے مغربی تہذیب عالم اسلام کو سماجی اور عقلی مدہوشی سے بیدار کرنے کے لیے مناسب ذریعہ نہیں۔ یہ مدہوشی عملی دین کو بے کار اور بے عمل کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو عقلی اور روحانی بلندی حاصل کرنے کے لیے کس طرف دیکھنا چاہیے؟۔

جواب اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ سوال بلکہ جواب خود سوال ہی میں موجود ہے۔ اسلام جیسا کہ پہلے کئی بار کہا جا چکا ہے دل کے یقین کا نام ہی نہیں بلکہ واضح اصولوں پر مبنی انفرادی و سماجی زندگی کا مکمل نظام ہے۔ اس کو بالکل مختلف اخلاقی بنیادوں والی دوسری تہذیب کے ساتھ ضم کر کے صرف تباہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کا احیاء اس صورت میں ممکن ہوتا ہے کہ ہم اس کی حقیقت کی طرف آئیں جہاں یہ ہمارے انفرادی و سماجی وجود پر ہر لحاظ سے حاوی ہو جائے۔

اسلام اس متنازعہ ثقافتی لہروں کے دور میں جو ہمارے وقت کا خاصہ ہیں مزید کھوکھلے تصورات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کی طلسماتی نیند کا خاتمہ ہو چکا ہے اب اس کو ابھرنا ہے یا مرنا ہے۔ آج کے مسلمان کا مسئلہ ایسا ہی ہے جیسے مسافر دوراہے پر۔ وہ جہاں کھڑا ہے وہاں کھڑا رہ سکتا ہے مگر اس صورت میں اسے فاقہ یا موت کا خطرہ ہے۔ ایک راستہ پر لکھا ہے ''مغربی تہذیب'' وہ اس پر بھی چل سکتا ہے مگر اس صورت میں اسے اپنے ماضی کو خیر باد کہنا ہوگا۔ دوسری طرف لکھا ہے ''حقیقی اسلام''۔ یہی وہ راستہ ہے جو اپنے ماضی اور خوشگوار مستقبل پر یقین رکھنے والے اہلِ ایمان کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

باب ششم

حدیث وسنّت

پچھلے کئی عشروں میں روحانی اطباء نے تہذیب اسلام کے جسم بیمار کے لیے کئی نسخے تجویز کیے اور بہت سے اصلاحی مشورے دیئے گئے۔ مگر اب تک سب کچھ بیکار گیا کیونکہ اب تک ان لوگوں نے (جن کی آواز سنی جاتی ہے) اپنی ادویہ، اکسیر اور ٹانک کے ساتھ اس فطری غذا کو بھلا دیا جس پر مریض کی پہلی جسمانی نشو ونما ہوئی تھی۔ یہ غذا ہے ہمارے پیغمبر ﷺ کی سنّت جسے اسلامی جسم بیماری یا صحت دونوں صورتوں میں بآسانی ہضم کرسکتا ہے۔ تیرہ سو سال پہلے اسلامی عروج کا راز سمجھنے کے لیے بھی سنت نبوی کلیدی حیثیت رکھتی ہے اور آج ہمارے انتشار کو سمجھنے کے لیے بھی۔ سنت کا اتباع اسلامی وجود وارتقاء کے لیے ضروری ہے۔ سنت کو نظرانداز کرنا اسلامی زوال اور انتشار کے مترادف ہے۔ سنت اسلامی قلعہ کا فولادی ڈھانچہ تھا اور ہے اور اگر آپ ڈھانچہ کو عمارت سے الگ کردیں تو آپ کو حیرت نہیں ہونی چاہیے اگر گھر تاش کے پتوں کی طرح بکھر جائے۔

یہ سادہ سچائی جو اسلامی تاریخ کے تمام علماء تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں آج سب سے زیادہ غیر معروف ہے اور اس کی وجہ مغربی تہذیب کا بڑھتا ہوا اثر ہے۔ مگر یہ پھر بھی ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمیں آج کے زوال اور شرم ناک تباہی سے بچا سکتی ہے۔

سنت کا لفظ یہاں اپنے وسیع ترین معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب وہ مثال ہے جو حضور اکرم ﷺ نے اپنے قول وعمل سے ہمارے لیے قائم کی ہے۔ ان کی حیات پاک قرآن پاک کی جیتی جاگتی تصویر تھی اور ہم قرآن پاک کے ساتھ اسی وقت انصاف کرسکیں گے جب ہم اس شخصیت کا اتباع کریں جو اس کے ظہور کا ذریعہ تھی۔

ہم نے دیکھا کہ ایک شے جو اسلام کو دیگر تمام الہامی مذاہب سے ممتاز کرتی ہے وہ زندگی کے مادی و اخلاقی پہلوؤں میں مکمل مصالحت ہے۔ ابتدائی دور میں اسلام جہاں کہیں ظاہر ہوا اسے کامیابی حاصل ہوئی اور یہی اس کی کامیابی کا سبب تھا۔ اس نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ آخرت کے حصول کے لیے دنیا سے نفرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی یہ امتیازی خصوصیت واضح کرتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ انسانیت کی رہبری کے لیے انسانی زندگی کے مادی و روحانی پہلوؤں کو اتنی اہمیت کیوں دیتے تھے۔ اس لیے یہ اسلامی بصیرت نہ ہوگی اگر ہم حضور اکرمؐ کے ایک قول کو روحانی معاملات اور دوسرے کو معاشرتی زندگی اور روزمرہ کے معاملات سے متعلق قرار دیں۔ یہ بحث کہ ہم اول الذکر کو ماننے کے لیے تیار ہیں مگر موخر الذکر کو نہیں، ایک سطحی سوچ اور جذبے کا نتیجہ ہے اور اسی طرح غیر اسلامی ہے جیسے یہ نظریہ کہ قرآن کا فلاں فلاں حکم جاہل عربوں کے لیے تھا اور آج کی بیسویں صدی کے تہذیب یافتہ لوگوں کے لیے نہیں۔ اس نظریہ کے پس منظر میں مقامِ مصطفٰی کی اہمیت کو کم کرنے والی ذہنیت کارفرما ہے۔

جس طرح حیاتِ مسلم ان اصولوں پر مبنی ہونی چاہیے جس میں انسان کی جسمانی اور روحانی خاصیتوں میں مکمل تعاون ہو، اسی طرح اخلاقی، علمی، انفرادی و سماجی ہر لحاظ سے ہمارے رہبر پیغمبر ﷺ کی حیات ایک منظّم، مربوط و کامل نمونہ ہو۔ یہی سنت کے عمیق معنی ہیں۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

(الحشر ۵۹:۷)

''جو کچھ تمہیں رسول دیں وہ لے لو اور جس سے روکیں، رک جاؤ''۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے

تفرقت الیهود علی احدی و سبعین فرقه و تفرقت النصاری علی اثنین و سبعین فرقه ستفرق امتی علی ثلاث وسبعین فرقه. (سنن ابی داؤد جامع الترمذی)

یہودا کہتر فرقوں میں بٹ گئے۔ عیسائی بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور مسلمان تہتر فرقوں میں بٹ جائیں گے۔

اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عرب (۷۰) کے ہندسوں کا استعمال زیادہ کے لیے کرتے ہیں اور اس سے عدد ستّر (۷۰) مراد نہیں تو بھی ظاہراً پیغمبرؐ یہ کہنا چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں فرقے عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی زیادہ ہوں گے۔ انہوں نے فرمایا: "**کلھم فی النار الا واحدہ**" یہ سب کے سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک کے" اور جب صحابہ کرام نے استفسار کیا کہ وہ کون سا ہوگا تو فرمایا ما "**انا علیہ و اصحابی**" جو میرے اور میرے صحابہؓ کے اصولوں پر چلیں گے۔ قرآن پاک کی کئی آیات اس بات کو واضح طور سے بغیر کسی غلط فہمی کے امکان کے بیان کرتی ہیں۔

"نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ایمان نہیں رکھتے جب تک وہ تجھے اپنے تنازعات کا حکم (فیصلہ کرنے والا) نہ مان لیں اور جس پر تو فیصلہ کردے اس کے لیے (اپنے دل میں) کوئی ناپسندیدگی نہ رکھیں بلکہ پورے یقین کے ساتھ مان لیں"۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ. وَاللّٰهُ غَفُوْرٌرَّحِيْمٌ. قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ. فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (آلِ عمران ۳:۳۱-۳۲)

"کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ گناہ بخشنے والا رحیم ہے۔ کہہ دو اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اگر وہ پھر جائیں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا"۔

لہٰذا قرآن کے بعد سُنّتِ رسولؐ سماجی و انفرادی طرزِ حیات یعنی اسلامی قانون کا دوسرا

منبع ہے۔ درحقیقت ہمیں سنت کو قرآن کی واحد تشریح تسلیم کرنا پڑے گا تا کہ ہم اختلافات سے بچ سکیں اور عملی زندگی میں اس کو اختیار کر سکیں۔ قرآن کی کئی آیات تمثیلی انداز میں ہیں اور جب تک تشریح کا ایک واضح نظام نہ ہو مختلف طریقوں سے سمجھی جا سکتی ہیں۔ مزید یہ کہ کئی ایسے عملی اہمیت کے احکام ہیں جن کی تفصیل قرآن میں نہیں۔ اس کتاب پاک کی روح شروع سے لے کر آخر تک یکساں ہے مگر اس سے وہ عملی رویہ اخذ کرنا جو ہمیں زندگی میں اختیار کرنا چاہیے آسان نہیں۔ یہ ایمان رکھنا کہ یہ کلام اللہ ہے اور اپنے قالب میں کامل ہے، یہ مقصد کبھی نہیں رہا کہ اسے حیات رسول ﷺ سے الگ کیا جائے جو اس ہدایت کی عملی شکل ہے۔ اگلے باب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس حتمی نتیجہ پر پہنچنے کی وضاحت کی جائے کہ کیوں قرآن کو ہمیشہ کے لیے حضور اکرمؐ کی رہبرانہ والہامی شخصیت کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے؟ اس باب کے لیے مندرجہ ذیل بحث کافی ہوگی۔ ہماری منطق یہ کہتی ہے کہ قرآن کی تشریح کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی بہتر نہیں ہو سکتا جس کے ذریعے یہ کتاب انسانیت تک پہنچی ہے۔

آج کل یہ نعرہ ہم اکثر سنتے ہیں۔ ''آیئے قرآن کی طرف چلتے ہیں مگر سُنت کا غلامانہ اتباع ٹھیک نہیں'' یہ نعرہ دراصل اسلام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ وہ لوگ جو ایسا کہتے ہیں اس شخص کے مماثل ہیں جو کسی محل میں داخل ہونے کا خواہشمند ہے مگر اصل چابی جو اس محل کا دروازہ کھولتی ہے اسے استعمال نہیں کرنا چاہتا۔

اس طرح ہم ایک اہم سوال یعنی ان ذرائع کی سند کی طرف آتے ہیں جو ہم تک حیات طیبہ اور حدیث پہنچاتی ہے۔ یہ ذرائع اسلام کی پہلی چند صدیوں میں تشکیل دیے گئے اور حضور اکرمؐ کی احادیث و روایات آپؐ کے الفاظ اور عمل کے بارے میں بیانات جو صحابہ کرام کی سند سے بیان ہوئے اور تنقید سے گزرے، پر مشتمل ہیں۔ بہت سے جدید مسلم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سنت کا اتباع کرنے کو تیار ہوں گے مگر وہ احادیث کے مجموعہ پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے دور میں یہ ایک فیشن بن گیا ہے کہ احادیث کی سند اور پھر سُنت کے پورے ڈھانچے سے انکار کر دیا جائے۔

کیا اس رویہ کا کوئی سائنسی جواز ہے جس کی بنیاد پر حدیث کو اسلامی قانون کے مستند سرچشمہ کی حیثیت سے مسترد کیا جائے؟ ہم سمجھتے تھے کہ مخالفین اپنے بیان کی حمایت میں یقینی دلائل لائیں گے اور ہمیشہ کے لیے ان روایات کی سند جو حضور اکرم ﷺ کی جانب منسوب کی گئی ہیں، ختم ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا اپنی پوری کوشش کے باوجود مشرق و مغرب کے یہ خالص جذباتی نقاد اپنی تنقید کی حمایت میں کوئی سائنسی تحقیق پیش نہ کر سکے۔ یہ آسان بھی نہیں تھا کیونکہ جامعین احادیث، خصوصاً بخاری و مسلم نے ان احادیث کے جمع کرنے میں سند کا اتنا خیال رکھا جتنا کسی بھی انسان کے لیے ممکن ہو سکتا تھا۔ اس کسوٹی سے بہت زیادہ سخت کسوٹی استعمال کی گئی جو عموماً یورپی تاریخ نگار تاریخی واقعات جمع کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔

یہ ہماری کتاب کے موضوع سے باہر ہے کہ ہم ان تفاصیل میں جائیں اور باریک بینی سے اس کا مطالعہ کریں جو محدثین نے روایات کی سند کی تحقیق میں کیں۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ایک مکمل سائنس سامنے آئی جس کا واحد مقصد یہ تحقیق کرنا تھا کہ کس شکل میں اور کس طرح کوئی حدیث حضور اکرم ﷺ نے بیان کی۔ اس سائنس کی ایک شاخ ان لوگوں کی حیاتِ طیبہ کا ایک مسلسل اور مربوط سلسلہ ہے جس میں ان خواتین و حضرات کی زندگی کی ہر طرح تحقیق کی گئی اور ان لوگوں کی تفصیلی سوانح درج کی گئیں جو احادیث کے راوی ہیں۔ صرف ان لوگوں کی احادیث کو قبول کیا گیا جن کی زندگی اور طریقۂ انتقالِ حدیث' اس سخت پیمانے پر پورا اترا جو اسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ آج اگر کوئی شخص کسی حدیث کی سند پر کوئی اعتراض کرتا ہے تو اس کو غلط ثابت کرنے کی ذمہ داری اسی شخص پر پڑتی ہے۔ سائنسی طور پر یہ معقول نہیں کہ کسی تاریخی تحریر کی سچائی کو غلط قرار دیا جائے۔ اگر کوئی بحث کسی ایک یا دیگر مآخذ کے خلاف موجود نہ ہو اور دوسری طرف کوئی متضاد بیان بھی نہ پایا جاتا ہو تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ ہم روایات کو سچا مانیں۔ فرض کیا کوئی شخص محمود غزنوی کی جنگوں کے بارے میں بات کرتا ہے اور آپ فوراً کہتے ہیں نہیں مانتا کہ محمود غزنوی کبھی ہندوستان آیا بھی تھا، یہ ایک من گھڑت قصہ ہے جس کا تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں" اس

صورت میں کیا ہوگا؟ کوئی شخص جو علم تاریخ سے واقف ہوگا فوراً آپ کی غلطی کو درست کرنے کے لیے تاریخی واقعات بیان کرے گا جو اس مشہور سلطان کے زمانے کے لوگوں سے نقل ہوئے ہوں گے اور یہ پختہ ثبوت ہوگا پہلے شخص کے بیان کی حمایت میں۔ اس صورت میں آپ کو یہ ماننا پڑے گا ورنہ آپ کوئی ظاہری وجہ بتائے بغیر تاریخی حقائق کو جھٹلانے کے جرم میں خبطی کہلائیں گے۔ اس صورتحال میں ہم اپنے جدید نقادوں سے یہ پوچھنے کی جسارت کریں گے کہ اس طرح کا انصاف حدیث کے معاملے میں کیوں نہیں کرتے؟

حدیث کے غلط ہونے کی بنیادی وجہ یا تو پہلے منبع کا ارادتاً جھوٹ ہوگا یا اس کا رخ صحابہؓ کی جانب یا بعد میں حدیث کی اشاعت کرنے والوں کی جانب ہوگا۔ جہاں تک صحابہؓ کا تعلق ہے ان سے اس قسم کا امکان ابتداء ہی سے مسترد کیا جا سکتا ہے۔ ایسی توقعات کو خام خیالی قرار دینے کے لیے صرف تھوڑی سی نفسیاتی بصیرت کی ضرورت ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی شخصیت نے ان حضرات و خواتین کی حیات طیبہ پر جو زبردست نقوش چھوڑے تھے وہ نمایاں حقائق کے طور پر تاریخ میں نقش ہیں۔ کیا یہ بات قابلِ تصور ہے کہ وہ لوگ جو حضور اکرم ﷺ کے اشارے پر جان و مال کی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے تھے ان کے الفاظ کے ساتھ مذاق کریں گے جبکہ آپ گا فرمان **من كذب علي متعمدا فليتبوا مقعده من النار** ''جو کوئی جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے گا تو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے گا'' (صحیح بخاری۔ سنن ابی داؤد۔ جامع ترمذی۔ مسند ابن حنبل) صحابہ کو معلوم تھا، وہ حضور اکرمؐ کے الفاظ پر کامل یقین رکھتے تھے کیونکہ وہ آنحضورؐ کو اللہ کا ترجمان سمجھتے تھے۔ تو کیا نفسیاتی طور پر یہ ممکن ہے کہ وہ اس واضح حکم سے روگردانی کرتے؟

کسی جرم کی تفتیش میں جج کے سامنے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کسی کے فائدے کے لیے جرم کیا گیا ہوگا؟ یہی عدالتی سوال حدیث کے لیے بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ ان روایات کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جو بلاواسطہ کسی خاص فرد یا کسی خاص گروپ کے مقام سے متعلق تھیں یا وہ جعلی روایات جو پیغمبرؐ کے وصال کے بعد پہلی صدی میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے سیاسی دعوؤں سے متعلق تھیں

اور جنہیں اکثر محدثوں نے مسترد بھی کر دیا، کوئی اور وجہ نہیں ہوسکتی پیغمبر ﷺ کے الفاظ بدلنے کی۔ سیاسی مفادات حاصل کرنے کی غرض سے احادیث کے ایجاد کرنے کے امکان ہی کی وجہ سے حضرت امام بخاری و امام مسلم نے سختی سے ان تمام احادیث کو مجموعہ سے خارج کر دیا جن کا تعلق سیاسی واقعات سے تھا۔ جو باقی ہے وہ کسی کو سیاسی مفادات دینے سے بالاتر ہے۔

ایک اور نکتہ ہے جسے بنیاد بنا کر حدیث کی سند پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صحابہؓ سے، جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے الفاظ سنے، یا پھر دوسرے یا تیسرے سے کوئی غلطی سرزد ہوسکتی ہے وہ یہ کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں ذاتی طور سے سچ ہے مگر یا تو صحیح سنا نہ گیا یا یاد نہ رہا یا کوئی نفسیاتی مسئلہ ___ مگر اندرونی شواہد کم از کم صحابہؓ کی جانب سے اس قسم کی کسی بڑی غلطی کے خلاف جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ رہ رہے تھے، آپ کی ہر بات اور عمل ان کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ آپؐ کی شخصیت میں ایک جاذبیت تھی بلکہ اس ایمان کی وجہ سے بھی کہ یہ اللہ کی رضا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے باریک پہلوؤں کو بھی حضور ﷺ کی ہدایات و امثال کے مطابق ڈھالیں۔ اس لیے وہ آپ کے الفاظ کے معاملے کو غیر سنجیدگی سے نہ لیتے تھے بلکہ ان کی حفاظت تکلیف جھیل کر بھی کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان صحابہ نے جو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ فوری متعلق تھے دو دو افراد کا گروپ تشکیل دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک باری باری حضور اکرم ﷺ کے ساتھ موجود ہوا کرتا تھا اور دوسرے زندگی کے معاملات سلجھایا کرتے تھے اور جو کچھ وہ آپ ﷺ کو کہتے یا کرتے ہوئے پاتے ایک دوسرے کو بتاتے۔ وہ اتنے بے تاب تھے کہ کہیں آپ ﷺ کا کوئی عمل ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہوجائے۔ اس رویہ کے ساتھ یہ سمجھنا ناممکن ہے کہ احادیث کی طرف ان کا رویہ لاپرواہی کا ہوگا اور اگر سینکڑوں صحابہ کے لیے یہ ممکن تھا کہ قرآن پاک کو ایک ایک باریکی کے ساتھ حفظ کرسکیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اور تابعین، حدیث اپنے سینے میں بغیر کسی ردوبدل کے محفوظ رکھ سکیں۔

مزید یہ کہ راوی صرف ان احادیث کو سند کا درجہ دیتے ہیں جو ایک ہی شکل میں مختلف آزاد راویوں کے سلسلے سے مروی ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دو آزاد شہادتیں روایت کے ہر مرحلے پر اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کریں۔ تصدیق کی یہ جانچ اتنی سخت ہے کہ ایک ایک حدیث جو تین نسلوں میں منتقل ہوئی صحابہؓ سے لے کر جامع تک بیس یا اس سے زیادہ راویوں پر مشتمل تھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود کہ کوئی مسلمان روایات کو وہ درجہ اور سند نہیں دیتا ہے جو قرآن کو دی جاتی ہے۔ کسی بھی وقت حدیث کا تنقیدی مطالعہ نہیں رکا۔ محدثین اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ بے شمار جعلی (spurious) احادیث موجود ہیں جیسا کہ یورپی نقاد آسانی سے فرض کر لیتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ تنقیدی سائنس شروع ہی اس لیے کی گئی تھی کہ کھوٹے اور کھرے میں تمیز ہو سکے اور بخاری و مسلم اسی تنقیدی سوچ کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔ جھوٹی احادیث کا وجود حدیث کے پورے نظام کے خلاف مجموعی طور پر کچھ ثابت نہیں کرتا۔ ایسے ہی جیسے الف لیلیٰ کی تصوراتی کہانی کو ہم اس دور کے کسی مستند واقعے کے خلاف سند کے طور پر استعمال نہیں کر سکتے۔

آج تک کوئی نقاد منظم طریقے سے یہ ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوا کہ حدیث کا مجموعہ جو جانچ پڑتال کے بعد جامعین نے اکٹھا کیا ہے غلط ہے۔ مستند روایات سے انکار صرف اور صرف ایک سطحی اور جانبدارانہ سوچ ہے، غیر متعصب سائنسی تحقیق کا نتیجہ نہیں مگر آج کے دور میں بہت سے مسلمانوں میں اس رجحان کی موجودگی کا کھوج آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم اپنی منتشر خیالی، وقتی لذت پرستی اور مغرب سے مرعوبیت کی بناء پر اپنی زندگی اور اپنے اعمال کو قرآن و سنت سے ہم آہنگ نہیں کرنا چاہتے۔ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے اور اپنے ماحول کی کمزوریوں کو دبانے کے لیے نام نہاد نقاد حدیث و سنت کے اتباع کو غیر ضروری قرار دے دیتے ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو نبی پاک ﷺ کی بتائی ہوئی قولی و عملی تشریح و تفسیر کے

بجائے ہر شخص اپنے میلانات ور جحانات کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنے لگے گا۔اس طرح اسلام کا اعلیٰ اخلاقی و عملی، انفرادی وسماجی نظام پرزہ پرزہ ہو جائے گا۔

موجودہ دور میں جبکہ مغربی تہذیب کا اثر مسلم ممالک میں زیادہ سے زیادہ ہوتا جارہا ہے مسلم دانشوروں کا یہ رجحان ایک اور مقصد بھی لیے ہوئے ہے۔ مغرب کے طریقِ حیات کو اپنا کر سنت کے مطابق زندہ رہنا ناممکن ہے۔ مگر آج کی مسلم نسل ہر اس چیز سے محبت کرنے کی قائل ہے جو مغرب سے آئی ہے اور بدیسی تہذیب کی پوجا اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ درآمد شدہ ہے، طاقتور ہے اور مادی چمک رکھتی ہے۔ مغربیت ہی سب سے بڑا سبب ہے، ارشاداتِ محمد ﷺ اور ان کے ساتھ سنت کے پورے ڈھانچے کے غیر مقبول ہونے کا۔ سنت اتنی واضح طور سے مغرب کے بنیادی نظریات سے ٹکر کھاتی ہے کہ وہ لوگ جو اس سے متاثر ہیں اس مشکل سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتے۔ سوائے اس کے کہ سنت کو غیر مستند روایات پر مبنی قرار دے کر غیر متعلق اور غیر ضروری بنا دیا جائے اور اسے اسلام سے غیر منسلک کر دیں۔ اس کے بعد یہ آسان ہو جاتا ہے کہ قرآن کی تعلیمات کو اس طرح سے گھما پھرا دیا جائے کہ مغربی تہذیب کے ساتھ چلا جا سکے۔

باب ہفتم

سنت کی روح

جتنی اہم حقیقت سنت کا دینی وقانونی جواز ہے اتنا ہی اہم اس کا روحانی پہلو ہے۔ اسلامی نظریہ سے سنت کے اتباع کو اسلام کے ساتھ ناگزیر کیوں سمجھا جائے؟ کیا اسلام کی حقیقت پانے کا کوئی دوسرا راستہ سوائے ان اعمال وطریقوں اور اوامر ونواہی کے وسیع نظام کے ہے جن میں کچھ تو بظاہر نہایت معمولی نوعیت کے ہیں مگر حیاتِ رسول ﷺ سے اخذ شدہ ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عظیم ترین تھے مگر کیا عقل کی یہ ضرورت انسانی شخصیت کی فطری انفرادی آزادی پر قدغن لگانے کے مترادف نہیں؟ یہ ایک قدیم اعتراض ہے جو اسلام کے نامہربان نقادوں کی طرف سے عائد کیا جاتا ہے کہ سنت کی سختی سے پابندی ہی عالمِ اسلام کے زوال کا اصل سبب ہے کیونکہ یہ آخری رویہ انسانی آزادی اور اس کے فطری ارتقاء میں حائل ہوتا ہے۔ اسلام کے مستقبل کے لیے یہ انتہائی اہم ہے کہ ہم اس اعتراض سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں یا کہ نہیں؟ سنت کی طرف ہمارا رویہ اسلام کے مستقبل کی نشان دہی کرے گا۔

ہمیں فخر ہے اور یہ فخر ہی ہے کہ ہمارا دین تصوف کے غیر استدلالی نظریات پر مبنی نہیں بلکہ عقل کی کسوٹی کے لیے ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔ ہمیں یہ جاننے کا حق ہے کہ ہم پر سنت کے اتباع کی جو پابندی لگائی گئی ہے اس کی اصل وجہ کیا ہے؟

اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں کی نشو ونما ایک اکائی کی طرح کرنے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس مقصد کی جانب ایک ذریعہ ہونے کے ناتے یہ دین مجموعی تصورِ حیات پیش کرتا ہے جس میں نہ کچھ گھٹایا جا سکتا ہے اور نہ بڑھایا۔ اسلام میں اختیار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جب کبھی قرآن میں یا حضور اکرم ﷺ کی جانب سے کسی تعلیم کا اظہار ہوتا ہے تو ہمیں اسے من و عن ماننا ہوتا ہے ورنہ وہ اپنی وقعت کھو دیتے ہیں۔ یہ سمجھنا ایک بنیادی غلطی ہے۔ چونکہ اسلام ایک عقلی دین ہے تو یہ اپنی تعلیمات کو انفرادی اختیار کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ یہ دعوی عقلیت کے ایک غلط تصور کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ عقل اور معقولیت کے فلسفوں میں ہر دور اور ہر وقت میں ایک واضح خلیج حائل رہی ہے۔ دین و مذہب میں عقل کا کردار ایک نگران کا ہوتا ہے۔ اس کا کام یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کوئی ایسی چیز انسانی ذہن پر مسلط نہ کی جائے جسے وہ فلسفیانہ کرشمہ سازیوں کے بغیر آسانی سے برداشت نہ کر سکے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے غیر متعصب عقل نے اسے ہمیشہ اعتماد کا ووٹ دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ جو کوئی بھی اسلام کے ساتھ وابستہ ہوگا اسلامی تعلیمات کو اپنے لیے ضروری تسلیم کرے گا۔ یہ ایک مزاجی معاملہ بھی ہے اور روحانی تجلی کا بھی۔ ہر غیر متعصب شخص یقیناً یہ مانے گا کہ اسلام میں کوئی بات عقل سے متضاد نہیں۔ بے شک ایسی بہت سی باتیں ہیں جو انسانی عقل سے بالاتر ہیں مگر اس سے ٹکر نہیں کھاتیں۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کہ مذہبی معاملات میں عقل کا کردار نگراں کا ہے، ایک ایسے آلہ کا جو ہاں یا نہیں کہتا ہے جیسی صورتحال بھی ہو۔ مگر معقولیت کے ساتھ یہ صورتحال نہیں بلکہ وہ نگرانی اور تسجیل کے کردار سے آگے بڑھ کر خیالی گھوڑے دوڑانے لگتی ہے۔ منطق کو اپنی حدود کا علم ہے مگر عقلیت اپنے دعوؤں میں بہت آگے جاتی ہے اور پوری دنیا اور اس کے اسرار و رموز کو اپنے انفرادی احاطۂ سوچ میں لے آتی ہے۔ وہ مذہبی امور میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتی کہ کچھ چیزیں عارضی یا مستقل طور پر عقل کی دسترس سے باہر ہیں بلکہ وہ سائنس کے توسط سے یہ امکان بھی اپنے تصرف میں رکھتی ہے۔

اس بے سروپا عقلیت پسندی ہی کے نتیجے میں آج کا جدید مسلم اپنے آپ کو پیغمبر ﷺ کی ہدایات کے حوالے کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔ مگر آج ہمیں یہ یقین دلانے کے لیے کسی Kant کی ضرورت نہیں کہ انسانی عقل بہت شدت سے اپنے امکانات میں محدود ہے۔

ہمارا ذہن اپنی فطرت کے لحاظ سے نظریہ مجموعیت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ ہم چیزوں کو ان کی تفصیل میں دیکھتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ لامحدودیت اور ابدیت کیا شے ہے؟ ہم یہ تک نہیں جانتے کہ زندگی کیا ہے؟ اس لیے الہامی مسائل میں ہمیں ایک ایسے رہبر کی ضرورت ہے جس کا ذہن اور دائرہ علم، عام منطق اور داخلی معقولیت سے آگے بڑھ کر بھی کچھ رسائی رکھتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جس پر وحی آئی ہو یعنی پیغمبر (ﷺ)۔ اگر ہمارا ایمان ہے کہ قرآن اللہ کے الفاظ ہیں اور محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر تو ہم پر نہ صرف اخلاقی بلکہ عقلی طور سے لازم ہو جاتا ہے کہ ہم آپ کی ہدایت پر آنکھ بند کر کے چلیں۔ آنکھ بند کرنے سے مطلب یہ نہیں کہ اب ہم اپنی عقلوں پر پردے ڈال لیں، نہیں بلکہ اس کے برعکس اب ہمیں ان آنکھوں کو حصول علم کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ ہمیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے احکام کے چھپے ہوئے معانی اور مقاصد دریافت کرنے ہیں۔ میں ایک ایسے سپاہی کی مثال دینا چاہتا ہوں جسے اس کے کمانڈر نے حکم دیا ہو کہ ایک اہم مورچہ سنبھال لے۔ ایک اچھا سپاہی فوراً اپنے کمانڈر کا حکم مان لیتا ہے۔ اس صورت میں سپاہی کے سامنے وہ حتمی مقاصد ہوتے ہیں جو جنرل کے ذہن میں ہوتے ہیں جو اس کے اور اس کے مستقبل کے لیے بہتر ہیں۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو یعنی جنرل کے ذہن میں جو کچھ ہے وہ اگر سپاہی کے سامنے واضح نہ بھی ہو تو بھی سپاہی کے لیے جائز نہیں کہ وہ حکم کو ترک یا ملتوی کر دے۔ ہم مسلمان پیغمبر ﷺ کو تاریخ انسانیت کا بہترین کمانڈر سمجھتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ وہ دین کی سلطنت کے روحانی اور سماجی پہلوؤں کو ہم سے کہیں بہتر جانتے تھے۔ ہمیں یہ کرنے اور وہ نہ کرنے کا حکم دیتے وقت ان کے ذہن میں ہمیشہ ایک مقصد ہوتا تھا جو ہر شخص کی روحانی اور سماجی بھلائی کے لیے ہوا کرتا تھا۔ کبھی یہ مقصد واضح ہوتا ہے اور کبھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ کبھی ہم آپ ﷺ کے احکام کے عمیق معانی سمجھ لیتے ہیں اور کبھی محض ظاہری، سطحی اور فوری مقاصد ہی دیکھ پاتے ہیں۔ بہرصورت ہم پر لازم ہے کہ ہم حضور اکرم ﷺ کے تمام احکامات کا مکمل اتباع کریں۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ احکام بہت

اہم ہیں اور بعض زیادہ اہم نہیں۔ ہمیں ان احکام کو مقدم رکھنا ہے جو زیادہ اہم ہیں۔ مگر ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم چیزوں کو محض اس لیے چھوڑ دیں کہ وہ غیر ضروری نظر آتی ہیں کیونکہ قرآن پاک پیغمبر کے بارے میں فرماتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (النجم۵۳:۳)

''وہ اپنی خواہشات سے کچھ نہیں کہتے''۔

یعنی وہ صرف اس وقت بات کرتے ہیں جب کوئی معروضی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ان کے لیے یہ حکم ہے۔ اسی لیے اگر ہم اسلام کی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہتے ہیں تو ہم پر لازم ہے کہ سُنّت کی روح اور شکل دونوں کا اتباع کریں۔

ایک بار یہ معروضی ضرورت مسلّم ہو جائے کہ مسلمان کو سنت کا اتباع کرنا ہے تو یہ اس کا حق بلکہ فرض ہے کہ معلوم کرے کہ اس عمل کا سماجی و مذہبی ڈھانچے میں کیا کردار ہے اور ان مفصل نظام قوانین و کردار کے اصولوں کے جو مسلمان کی زندگی پر مہد سے لحد تک حکمرانی کرتے ہیں، کیا معنی ہیں؟ ان اعمال کا روحانی جواز کیا ہے جو انسانی وجود کے اہم ترین اور معمولی ترین ادوار میں اسے پابند کرتے ہیں یا کہ ان میں کوئی معنی نہیں۔ کیا اس میں کوئی بھلائی تھی کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ آپ وہ کچھ کریں جو حضور اکرمؐ نے کیا؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں سیدھے ہاتھ سے کھانا کھاؤں یا الٹے ہاتھ سے؟ داڑھی رکھنے اور نہ رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا یہ باتیں محض رسمی ہیں؟ یا ان باتوں کا انسانی یا معاشرتی ترقی پر کوئی اثر ہے؟ اگر نہیں تو ہم پر کیوں لاگو کی گئی ہیں؟

ہمارے لیے یہ سوچنے کا آخری موقع ہے کیونکہ اسلام کا عروج وزوال سنت کے ساتھ ہی ہے اور یہی سوال کا جواب ہے۔

میرے خیال میں سنت بحیثیت ادارے کے ہونے کے تین بنیادی اسباب ہیں:

پہلی وجہ ایک خاص انداز میں انسان کی تربیت کہ وہ مستقلاً شعور میں رہے جاگتا رہے اور خود اپنی نگرانی کرتا رہے۔ روحانی ترقی کے راستے میں غیر منظم عادات و اعمال ایسے ہی ہوتے

ہیں جیسے دوڑتے وقت گھوڑے کے راستے میں رکاوٹیں۔ ان کو کم سے کم کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ انسان کے روحانی ارتکاز کو تباہ کر دیتی ہیں۔ ہمارا ہر کام خوش دلی کے ساتھ اپنے اخلاقی مرکز کے حوالے سے ہونا چاہیے۔ مگر ایسا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے نفس کا مشاہدہ کرنا سیکھیں۔ اس مستقل خود احتسابی کو عمر بن خطابؓ نے بڑی خوبصورتی سے بیان فرمایا ہے:

حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا

''اپنا احتساب کرو اس سے پہلے کہ تمہارا احساب کیا جائے''۔

اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اعبد ربك كانك تراه (صحیح بخاری۔ صحیح مسلم۔ سنن ابی داؤد۔ نسائی)

''اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو''۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلام میں عبادت کے معنی پوری زندگی پر محیط ہیں۔ اس کا مقصد ہماری روحانی اور جسمانی ذات کو ایک اکائی بنانا ہے تو پھر زندگی میں ہماری جدوجہد کی سمت ان بے مقصد اور بے شعور عناصر کو حتی الامکان ختم کرنے کی طرف ہونی چاہیے۔ خود احتسابی اس راہ کا پہلا قدم ہے۔ اور اپنے آپ کو خود احتسابی میں تربیت دینے کا یقینی طریقہ یہ ہے کہ ان غیر اہم اعمال اور عادتوں کو پہلے قابو میں کیا جائے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، چھوٹے چھوٹے اعمال ذہنی تربیت کے سیاق وسباق میں درحقیقت ان بڑے اعمال سے کہیں زیادہ اہم ہیں جو اپنی بڑائی کی وجہ سے زیادہ تر شعور کے دائرے میں رہتے ہیں۔ چھوٹے اعمال ہماری توجہ سے ہٹ جاتے ہیں اور ہمارے قابو میں نہیں آتے۔ اس لیے ان پر گرفت نفس کو قابو کرنے کی قوتوں کو توانا کرنے کے لیے زیادہ ضروری ہے۔

شاید یہ عمل فی نفسہ زیادہ اہم نہ ہو کہ ہم دائیں ہاتھ سے کھائیں یا بائیں ہاتھ سے۔ داڑھی رکھیں یا نہ رکھیں مگر یہ نفسیاتی طور سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ہم چیزوں کو ایک نظم کے تحت لائیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ہم نفس کو خود مشاہداتی اور اخلاقیاتی جانچ کے اونچے درجہ میں لے

جاتے ہیں۔ یہ کوئی آسان عمل نہیں کیونکہ دماغی سستی جسمانی سستی کی طرح مسلّم ہے اگر آپ ایسے شخص سے لمبا فاصلہ طے کرنے کو کہیں جو سست طرزِ زندگی کا عادی ہو تو وہ جلد ہی تھک جائے گا اور آگے چلنے سے معذوری ظاہر کردے گا مگر ایسے شخص کے لیے جو ساری زندگی چلنے کی تربیت حاصل کرتا رہا ہے ایسا کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا کیونکہ اس کے لیے اس قسم کی عضلاتی محنت کوئی محنت ہی نہیں۔ یہ ایک جسمانی عمل ہے جس کا وہ عادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنت زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہے۔ اگر ہم مستقلاً اپنے اعمال و ترک اعمال کو شعوری تمیز کے زیرِ اثر رکھیں تو ہماری خود احتسابی بڑھتی رہے گی۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ ہماری فطرت ثانیہ بن جائے گی۔ بتدریج یہ تربیت بڑھ کر ہماری اخلاقی کمزوریوں کو ختم کردے گی۔

لفظ تربیت کا فطری مطلب ہی یہ ہے کہ نتیجہ کا انحصار شعوری عمل پر ہے۔ جس لمحہ سنت کا عمل میکانکی ہوجائے تو اس کی وقعت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی حال پچھلی کئی صدیوں سے مسلمانوں کا ہے۔ صحابہ اور تابعین نے شعوری سپردگی کے ساتھ اپنے وجود کو ہر لحاظ سے اپنے آقا کی مثال سے ہم آہنگ کیا تاکہ ایک ہادی ان کی حیات کو قرآن کی روح کے مطابق ڈھال دے۔ اس شعوری ارادے کی وجہ سے وہ سنت کی تربیت کا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اگر بعد کے آنے والے مسلمانوں نے ان نفسیاتی راستوں کا صحیح استعمال نہ کیا تو یہ اس نظام کی خامی نہیں۔ ممکنہ طور پر ترکِ عمل کا فلسفہ تصوف کے زیرِ اثر داخل ہوا جو عملیت سے واضح نفرت کا اظہار کرتا ہے اور انسانی قوتوں کے داخلی استعمال پر زیادہ زور دیتا ہے۔ چونکہ اتباع سنت ابتدا ہی سے حیاتِ اسلامی میں طے ہو چکا تھا اس لیے تصوف اسے جڑ سے نہ اکھیڑ سکا البتہ تصوف نے اس کی عملی قوت کو زائل کرکے اس کے فوائد کو ختم کردیا۔ سنت، صوفیوں کے لیے شاعرانہ تصور کی ایک تمثیل بن گئی جو پس منظر کا کام دیتی تھی۔ قانون بنانے والوں کے لیے قانون کا ایک نظام سمجھا گیا اور عام مسلمانوں کے لیے ایک کھوکھلا خول، جس کے کوئی معنی نہ ہوں۔ مگر باوجودیکہ مسلمانوں کو قرآن کی تعلیمات سے اور ان کی تعبیر بصورت سُنتِ رسول سے فائدہ اٹھانے میں ناکامی ہوئی یہ نظریہ اور اس کی

تعلیمات آج بھی ویسی ہی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ آج اسے عملی شکل نہ دی جا سکے۔ سُنت کا مقصد وہ نہیں جو مخالفین اور نقاد سمجھتے ہیں یعنی ''رسم و نقل'' بلکہ باشعور، پختہ یقین کا حامل، وسیع النظر عملی انسان، مستقل شعوری بیداری اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ جو عمل کرتے ہیں دراصل وہ سنت کی پیروی ہے اور اس طرح کے عمل میں اس کا راز، اعجاز اور زبردست تاریخی کامیابی پنہاں ہے۔

یہ ہے سنت کا اصل اور انفرادی پہلو۔ اس کا دوسرا پہلو اس کی سماجی اہمیت اور افادیت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سماجی تنازعات میں سے اکثر ایک دوسرے کے ارادوں اور اعمال کے متعلق غلط فہمی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس غلط فہمی کا سبب معاشرے میں انسان کے مزاج اور میلانات میں وسیع اختلافات کی موجودگی ہے۔ مختلف قسم کے مزاج، انسانوں میں مختلف قسم کی عادات پیدا کرتے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتی جاتی ہیں اور انسانوں کے درمیان خلیج کا باعث بنتی ہیں۔ اس کے برخلاف اگر مختلف لوگ اپنی زندگیوں میں بہت سی یکساں عادتیں رکھتے ہوں تو اس بات کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ ان کے آپس کے تعلقات بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو ہمدردی سے سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔ اسی لیے اسلام نے (جو انسان کے سماجی و انفرادی ارتقاء کا یکساں خیال رکھتا ہے) یہ ایک اہم ضرورت سمجھی کہ معاشرہ کے افراد کو منظم طریقے سے راغب کیا جائے کہ اپنی عادات و رسوم کو ایک دوسرے کے مشابہ کرلیں۔ چاہے ان کے معاشی و معاشرتی مقام کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔

مگر اس سے بھی آگے بڑھ کر سُنت اپنی مستحکم حیثیت کی وجہ سے معاشرہ کی اور بھی خدمت کرتی ہے۔ یہ معاشرے کو مربوط اور منظم بناتی ہے اور اس طرح ان تنازعات اور عداوتوں کا خاتمہ کر دیتی ہے جو سماجی مسائل کی حیثیت سے مغربی دنیا کو پریشان کرتے رہے ہیں۔ یہ سماجی مسائل اس وقت اور زیادہ ابھرتے ہیں جب کچھ ادارے یا رسوم نامکمل اور ادھورے نظر آنے کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لیے جو اپنے آپ کو قرآنی احکام کا پابند سمجھتے ہیں

اور پھر پیغمبر کی ہدایات پر عمل کرنے سے ان کا معاشرے کی شکل میں ظاہری تصفیہ ہوتا ہے، الہامی بنیادوں پر استوار ہونے کی وجہ سے (جب تک اس کے منبع پر شک نہ ہو) ان سماجی تنظیموں کی بنیاد پر حملہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ قرآن نے جو تصویر پیش کی ہے کہ مسلم ایک ٹھوس دیوار کی طرح (بنیان مرصوص) ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنی قوتوں کو جزوی اصلاحات اور ضمنی باتوں پر ضائع کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ مقامی جھگڑوں سے آزاد اور اللہ کے قوانین اور حضورؐ کی مثالوں کے ستون سے مضبوط اسلامی معاشرہ اپنی تمام قوتیں، مسائل کے حل اور مادی و عقلی بھلائی کے کاموں پر صرف کر سکتا ہے۔ اس طرح فرد کی روحانی جدوجہد کے لیے راستہ ہموار ہوگا۔ یہی اور صرف یہی اسلام کے سماجی نظام کا مقصد ہے۔

اب ہم سنت کے تیسرے پہلو کی طرف آتے ہیں کہ ہمارا صحیح معنوں میں اس پر عمل کرنا کیوں ضروری ہے؟

اسی نظام میں ہماری زندگی بہت سی تفاصیل کے ساتھ حضور اکرمؐ کی زندگی پر مبنی ہے۔ ہم کچھ بھی کریں یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اس سے مشابہ کام حضورؐ نے کس طرح کیا۔ یا اس کام کے بارے میں آپ کا فرمان کیا ہے۔ اس طرح عظیم ترین انسان کی شخصیت ہماری شخصیت کے روزمرہ کاموں میں آجاتی ہے اور اس کا حقیقی اور متواتر اثر ہماری شخصیتوں پر ہوتا ہے۔ نتیجتاً ہم شعوری اور تحت الشعوری طور پر حضور اکرمؐ کے رویے کو اس عمل کے تحت قبول کرنے لگتے ہیں۔ ہم آپ کو نہ صرف اخلاقیات کا علمبردار سمجھنے لگتے ہیں بلکہ کامل زندگی کی طرف لے جانے والا رہنما بھی۔ یہاں ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آیا پیغمبر کو ہم صرف عقل مند آدمیوں میں سے ایک آدمی تصور کریں یا اللہ کے سب سے بڑے پیغمبر، جن کا ہر عمل اللہ کی رضا سے ہوتا تھا۔ قرآن کا نقطہ نظر اس سلسلے میں بڑا واضح اور ہر قسم کی امکانی غلطی سے پاک ہے کہ ایک شخص جسے خاتم النبیین اور تمام جہانوں کے لیے رحمت بنایا گیا ہو اس کا سارا وقت مستقل طور پر الہامی رہنمائی کا ذریعہ ہی ہو سکتا

ہے۔ان کی ہدایات سے انکار کرنا یا اس کے کسی عنصر سے انکار کرنا یا اس کی اہمیت کو کم سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے اللہ کی ہدایت کو وقعت نہ دینا جس کا مزید منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ گویا اسلام کا پورا پیغام آخری نہ تھا بلکہ انسانی مسائل کے بہت سے حلوں میں سے ایک ممکنہ حل اور علاج ہوسکتا ہے۔انسان کو اختیا رہے کہ اپنی عقل کے مطابق کسی ایک طریقے کو اپنا لے۔ یہ آسان حل جو کہ اخلاقی اور عملی طور سے کسی بندھن سے بندھا ہوا نہیں ہمیں کہیں بھی لے جا سکتا ہے مگر یہ یقیناً ہمیں اسلامی روح کی طرف نہیں لے جائے گا جس کے بارے میں قرآن پاک میں آیا ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدۃ ۵:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں کامل کر دیں اور دین اسلام کو تمہارے لیے منتخب کیا''۔

ہم اسلام کو تمام مذاہب عالم سے ممتاز سمجھتے ہیں اس لیے کہ یہ پوری زندگی کو مجموعی نظر سے دیکھتا اور بیان کرتا ہے۔ یہ دنیا و آخرت، روح و جسم، اور فرد و معاشرہ کو برابر توجہ دیتا ہے۔ یہ نہ صرف انسانی فطرت کے بلند امکانات پر نظر رکھتا ہے بلکہ اس کی مجبوریوں اور کمزوریوں کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہے۔ یہ ہم پر ناممکن عمل لاگو نہیں کرتا بلکہ ہمیں اپنے امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی سمت لے جاتا ہے جہاں عمل اور نظریہ کے درمیان کوئی عداوت نہیں۔ یہ کئی راستوں میں سے ایک نہیں بلکہ واحد راستہ ہے اور وہ شخص جس نے یہ تعلیمات دیں وہ کئی رہنماؤں میں سے ایک نہیں بلکہ حقیقی رہنما ہے۔ اس کے اعمال میں اس کا اتباع اسلام کا اتباع ہے اور سنت کو چھوڑنا دراصل اسلام کو چھوڑنا ہے۔

باب ہشتم

حاصل مطالعہ

میں نے پچھلے ابواب میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اپنے حقیقی معنوں میں مغربی تہذیب کے اندر ضم ہو کر فیضیاب نہیں ہوسکتا مگر دوسری طرف حال یہ ہے کہ عالمِ اسلام میں قوت کی اتنی کمی ہے کہ وہ کوئی مزاحمت نہیں کرسکتا۔ اس کے ثقافتی وجود کی باقیات ہر جگہ مغربی دباؤ ور سوم کے تحت زمین بوس کی جارہی ہیں۔ دست برداری کا دور دورہ ہے جبکہ قوموں کی زندگی میں دست برداری موت کا درجہ رکھتی ہے۔

اسلام کے ساتھ کیا ہو گیا ہے؟ کیا یہ واقعی ہمارے دشمنوں اور ہماری اپنی صفوں میں موجود شکست خوردہ عناصر کے بقول ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟ کیا دینی افادیت کا دور گزر چکا ہے اور اسلام دنیا کو وہ کچھ دے گیا جو اسے دینا تھا؟

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمام انسانی ثقافتیں اور تہذیبیں زندہ وجود کی طرح ہوتی ہیں۔ وہ حیات کے مختلف ادوار سے گزرتی ہیں، پیدا ہوتی ہیں، شباب پر آتی ہیں، پختہ ہوتی ہیں اور بعد ازاں زوال پذیر ہو جاتی ہیں۔ پودوں کی طرح جو سوکھ کر گرتے اور گر کر خاک ہو جاتے ہیں۔ ثقافت بھی اپنا وقت پورا کر کے مر جاتی ہے اور دوسری ثقافتوں کے لیے جگہ خالی کر جاتی ہے۔

کیا اسلام کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ سطحی نظر سے دیکھنے والوں کو ایسا ہی محسوس ہوتا ہوگا۔ بے شک اسلامی ثقافت نے اپنا شاندار ارتقاء دیکھا اور پھلی پھولی۔ اس میں قوت تھی کہ انسانوں کو عمل اور ایثار کے لیے ابھار سکے۔ اس نے قوموں بلکہ کرۂ ارض کے چہرے کو بدل ڈالا۔ پھر یہ ثقافت جامد ہو گئی اور گلنے سڑنے لگی اور خالی خول بن کر رہ گئی۔ آج ہم اس کے مکمل زوال اور بے قدری کے شاہد ہیں۔ مگر کیا یہی انجام ہے؟

اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام محض دیگر ثقافتوں میں سے ایک ثقافت نہیں، یہ انسانی سوچ اور کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ قوانین خداوندی کا ایسا مجموعہ ہے جو تمام انسانوں کے لیے اور تمام وقتوں کے لیے ہے تو نقطۂ نظر قطعاً بدل جاتا ہے۔ اگر اسلامی ثقافت وحی کے ذریعے آئے ہوئے قوانین کے اتباع کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی تو ہم کبھی یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ یہ بھی دوسری ثقافتوں کی طرح زمان و مکاں کی زنجیروں میں قید ہے۔ جو کچھ اسلام کے زوال کی صورت میں نظر آتا ہے دراصل ہمارے دلوں کا کھوکھلا پن ہے جو اتنے سست اور کاہل ہیں کہ ابدی آواز سننے کے قابل نہیں۔ دنیا اسلام سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ زمانہ اسلام کے مقابلے میں اخلاقیات کا کوئی اور بہتر قانون وضع نہیں کر سکا۔ دنیا نے اخوت و برادری کا کوئی ایسا عملی نظام بھی وضع نہیں کیا جو اسلام کے ملک و قوم سے بالاتر اُمت کے تصور کا ہم پلّہ ہو۔ کوئی ایسا سماجی ڈھانچہ بھی وضع نہیں کیا گیا جس کے نتیجے میں قوموں کے درمیان تنازعات اور جھگڑوں کو کم سے کم کر دیا جائے جیسا کہ اسلام کے سماجی نظام میں ہے۔ ایسا بھی کوئی نظام نہیں دیا گیا جو انسان کی تکریم بڑھائے، اس کے احساسِ تحفظ اس کی روحانی امید اور نتیجتاً اس کی خوشی میں اضافہ کر سکے۔

ان تمام میدانوں میں انسانی نسل کی کامیابیاں اسلام کے مقابلے میں کہیں کم ہیں تو پھر یہ کہنا کہاں کا انصاف ہے کہ اسلام زمانے سے پیچھے رہ گیا ہے؟ کیا صرف اس لیے کہ اس کی بنیادیں مذہب پر استوار ہیں اور مذہبی طرزِ فکر اس دور کا تقاضا نہیں؟ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نظام جس کی بنیاد مذہب پر ہے زندگی کا ایسا عملی پروگرام پیش کرتا ہے جو زیادہ کامل، زیادہ ٹھوس اور کسی بھی انسانی نظام کے مقابلے میں، جو اصلاحات اور مشاورت کے ذریعے وجود میں آیا ہو، انسانی نفسیات کے زیادہ قریب ہے تو کیا یہ وزنی دلیل مذہبی نقطہ نظر کے لیے کافی نہیں؟

انسان کی مثبت کامیابیوں نے بھی اسلام ہی کا بول بالا کیا ہے کیونکہ اسلام نے ان کے حصول و تصور سے بہت پہلے ان کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ دوسری طرف انسان کی غلطیوں اور کمزوریوں میں بھی اسلام سرخرو ہوا۔ کیونکہ انسان نے اپنے ارتقاء کے عمل میں بڑی ٹھوکریں کھا

کر غلط کو غلط تسلیم کیا جبکہ اسلام نے بہت پہلے بلند آواز میں ان کے غلط ہونے سے آگاہ کردیا تھا۔ مذہبی یقین کو بالائے طاق رکھنے کے باوجود اسلام میں خالص عقلی بنیادوں پر وہ کشش موجود ہے جس کی بناء پر پورے اعتماد کے ساتھ اس کی عملی ہدایات کا اتباع کیا جاسکتا ہے۔

اگر ہم اپنی ثقافت وتہذیب کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں تو ہم لازماً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسلام کا احیاء ممکن ہے۔ ہمیں اسلام کی اصلاح کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ بہت سے مسلمان سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہ کامل ہے بلکہ اسلام کی جانب اپنے رویہ، اپنی سستی، اپنی خودستائشی اور اپنی کوتاہ نظری کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ بالفاظ دیگر اپنی کمزوریاں نہ کہ اسلام کی کمزوریاں دور کرنا ضروری ہیں۔

اسلام کے احیاء کے لیے ہمیں نئے اصولوں کی ضرورت نہیں بلکہ ہمیں پرانے بھلائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم باہر سے نئی تحریکیں قبول کر سکتے ہیں مگر ہم اسلامی ضمیر کو غیر اسلامی خمیر سے نہیں بدل سکتے۔ چاہے وہ مشرق سے آئے یا مغرب سے۔ اسلام ایک روحانی وسماجی ادارہ ہے جسے بہتر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ پہلے ہی بہترین ہے۔ ان حالات میں اسلام کے سماجی نظام یا روحانی تصورات میں اجنبی ثقافت کے زیرِ اثر کوئی تبدیلی لانا ترقی معکوس کے مترادف ہے جو کہ تباہی اور بربادی ہوگی۔ تبدیلی ضرور آنی چاہیے مگر یہ تبدیلی ہماری صفوں سے ابھرنی چاہیے جو ہمیں اسلام کی سمت لے جائے نہ کہ اسلام سے دور۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد ہمیں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ اسلامی دنیا بحیثیت ایک آزاد ثقافتی عنصر کے اپنا مقام کھوچکی ہے۔ میں یہاں اسلامی سیاست کے زوال کی بات نہیں کررہا ہوں۔ ہماری موجودہ حالت کا اہم ترین نقش ہمارے ایمانی، عقلی اور سماجی دائرہ میں نظر آتا ہے۔ ہمارے ابتدائی دور کی خالص عظمت میں سے کچھ بھی نہیں رہا۔ کچھ بھی نہیں بچا۔ جس حالت سے ہم گزر رہے ہیں صاف ظاہر کررہی ہے کہ توازن کی وہ قوتیں جو کبھی اسلام کی عظمت کی امین تھیں تقریباً ختم ہوچکی ہیں۔ ہم نہ جانے کس ثقافتی خاتمہ کی جانب ڈانواں ڈول ہو

رہے ہیں۔ان بیرونی قوتوں کی مزاحمت کے لیے جو ہمارے دین اور ہمارے معاشرے کے لیے تباہ کن ہیں ہمارے ہاں عقلی حوصلہ باقی ہے نہ قوتِ ارادی۔ ہم نے بہترین اخلاقی قوت کو ایک طرف پھینک دیا ہے۔ ہم اپنے ایمان کو جھٹلاتے ہیں جبکہ ہمارے آباء کے لیے یہی شوقِ زندگی تھا۔ہم شرمسار ہیں جبکہ وہ اسے سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ہم پس ماندہ اور اپنی ذات میں گم ہیں جبکہ انہوں نے فراخ دلی سے دنیا کے لیے اپنے آپ کو کھول دیا تھا۔ہم خالی ہیں جبکہ وہ پُر تھے۔

اس مرثیہ سے ہر سوچنے والا مسلم آگاہ ہے۔ ہر شخص نے اسے بارہا سُنا۔تو کیا اسے پھر دہرانے سے کوئی فائدہ ہے؟ ہاں میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہے کیونکہ زوال کی اس شرمناک حالت سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں سوائے اس کے کہ ہم اس شرمساری کو محسوس کریں۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دن رات رکھیں اور اس کی تلخی سے آگاہ ہوں۔ یہاں تک کہ ہم پختہ ارادہ کرلیں کہ اسے کیسے مٹانا ہے۔تلخ حقیقت چھپانے سے کم نہیں ہو جاتی۔ یہ سمجھنا کہ اسلامی دنیا میں ہلچل پیدا ہو رہی ہے اور یہ کہ تبلیغی پروگرام چار براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ کہ مغرب کے لوگ زیادہ سے زیادہ اسلام کی حقیقت کو سمجھ رہے ہیں اور استثنائی دلائل استعمال کرتے ہوئے اپنے آپ کو فریب دینا کہ ہماری تفضیحیک گہری نہیں ہے، محض سراب ہے۔

مگر کیا یہی اختتام ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہماری نئی زندگی کی آرزو اور ہم میں سے اکثر کی یہ تمنا کہ ہم اپنی موجودہ حالت کو بدلنا چاہتے ہیں ہمیں امید کا پیغام دیتی ہے کہ ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ابھی احیاء کا راستہ باقی ہے اور یہ راستہ ہر اس شخص کو نظر آتا ہے جس کے پاس دیکھنے کے لیے آنکھیں ہیں۔

ہمارا پہلا قدم اسلام کے لیے اپنے نادمانہ رویہ سے نجات حاصل کرنا ہونا چاہیے جو دراصل عقلی شکست کا دوسرا نام ہے۔ یہ دراصل اپنے شک کو چھپانے کے مترادف ہے جو اسلام کے بارے میں ہمیں پیدا ہو گیا ہے۔ دوسرا قدم محمد ﷺ کی سنت کا شعوری اور ارادتاً اتباع ہے کیونکہ سنت اسلام کی عملی شکل کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسے زندگی کے ہر گوشے میں ایک جانچ کی

حیثیت سے استعمال کرتے ہوئے ہم آسانی سے یہ جان لیں گے کہ کون سے محرکات ہیں جو ہم اپنی ضروریات زندگی کے لیے مغرب سے لے سکتے ہیں اور کون سے ہمیں مسترد کر دینے چاہییں۔ بزدلی سے اسلام کو اجنبی عقل کے دھاروں کے حوالے کرنے کے بجائے ایک بار پھر اسلام کو محور بنا کر دنیا کو اسلام کے حوالے سے دیکھنا ہوگا۔

تاہم یہ صحیح ہے کہ کئی بنیادی اداروں کو غلط پس منظر (غیر صحیح مگر مقبول تشریحات) میں دیکھنے کی وجہ سے وہ مسلمان جو آج اصل منبع کی طرف خود نہیں جا سکتے، اسلام اور اسلامی فلسفے کی جو بگڑی ہوئی شکل دیکھتے ہیں اور وہ نا قابلِ بیان دعوے جسے تقلید پسند اسلام کی بنیاد قرار دیتے ہیں ان روایتی تشریحات کے سوا کچھ بھی نہیں جو یونانی منطق پر مبنی تھیں اور جو دوسری اور تیسری صدی ہجری میں تو قابلِ عمل ہوں گے مگر آج کے دور میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ مسلمان جو مغربی تعلیم سے آراستہ ہیں مگر عربی اور فقہ کی پیچیدگیوں سے ناواقف ہیں، شخصی آراء پر مبنی ان پرانی تشریحات و تصورات کو الہامی قانون سے تعبیر کرتے ہیں اور جب وہ انہیں ناقص پاتے ہیں تو مایوسی کے عالم میں اسلامی شریعت ہی سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ اس لیے انہیں دوبارہ تخلیقی قوت میں بدلنے کے لیے اسلام کے پیغام کو اصل منبع کی روشنی میں ازسرِنو ترتیب دینا ہوگا جو ان روایتی تشریحات سے آزاد ہوں جو صدیوں سے چلی آرہی ہیں۔ مگر جو آج کے دور کے تقاضوں کے لیے بلاکم و کاست ناکافی ہیں۔ ان تمام کوششوں کا نتیجہ ایک نئے فقہ کی صورت میں ہوسکتا ہے جو اسلام کے دو منابع سے مطابقت رکھتا ہو۔ قرآن اور حضور اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کی مثال جو آج کے زمانے کی ضرورتوں کا خوش اسلوبی سے پورا پورا احاطہ کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے قدیم اندازِ فکر جو اپنے دور کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے تھے اور اس زمانے کے حالات کے مطابق تھے جس میں ارسطوئی اور افلاطونی فلسفہ قابلِ ذکر ہیں۔

مگر ہم صرف پرانا اعتماد بحال کرنے کے بعد ہی اوپر کی سمت جا سکیں گے۔ ہم اس مقصد کو کبھی حاصل نہ کر سکیں گے، اگر ہم اپنے سماجی اداروں کو تباہ کر کے اجنبی تہذیب کی نقل کریں

جونہ صرف تاریخی وجغرافیائی لحاظ سے بلکہ روحانی لحاظ سے بھی اجنبی ہے۔

آج کل کے حالات میں اسلام ایک ڈوبتا ہوا سفینہ ہے اور جہاز میں موجود تمام حضرات کی مدد اس سفینہ کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے درکار ہے۔ یہ سفینہ اسی وقت بچ سکتا ہے جب مسلمان قرآن کی آواز سنیں اور سمجھیں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (الاحزاب۳۳:۲۱)

”بے شک تمہارے لیے پیغمبر بہترین مثال ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور قیامت کے دن کے طلبگار ہیں“۔

ہماری دیگر مطبوعات

دعوۃ اکیڈمی
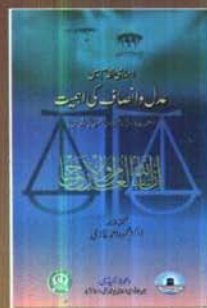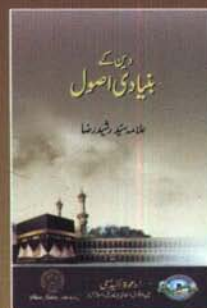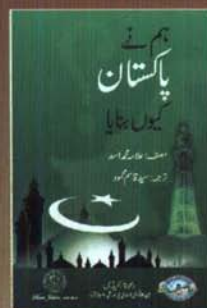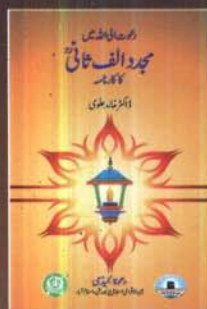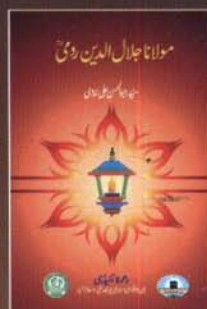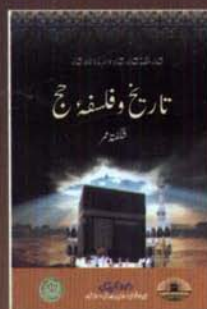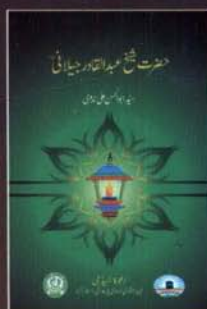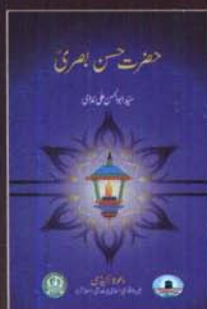
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

پوسٹ بکس: 1485 اسلام آباد، پاکستان، فون: 2262031، 051-9261751، فیکس: 051-2261648

ای میل: publications.da.iiui@gmail.com، ویب سائٹ: dawah.iiu.edu.pk